آگ گلستاں بنی
سعیدہ گزدر

آگ گلستاں بنی

سعیدہ گزدر

پاکستانی ادب پبلیکیشنز ۔ کراچی

ناشر : عبدالحلیم
پاکستانی ادب پبلیکیشنز
۱۴۱-اے سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی - کراچی

مطبع : کتب پرنٹرز اینڈ پبلشرز لمیٹڈ
ایم اے جناح روڈ - کراچی

قیمت : بیس روپے

۱۹۸۰ء

اُن کے نام

جنہوں نے جمہوریت اور انسانی وقار کی خاطر
اذیتّیں برداشت کیں اور شہید ہوئے

ترتیب

آگ گُلستاں نہ بنی

دیوداسی نے پوچھا۔
"راہ گیر! تم کدھر بھاگے جا رہے ہو۔
اور تم نے یہ کٹھن سفر کیوں اختیار کیا؟"
راہ گیر نے منہ کھولا۔
"گِل[1] گامیش نے شہر کو ناپاک کر دیا ہے۔
وہ چاہتا ہے کہ دلہن شبِ عروسی اس کے ساتھ گزارے
پہلے بادشاہ، بعد میں جائز شوہر۔
اور یہ سب دیوتاؤں کی مرضی سے ہو رہا ہے۔
اب دلہن چھننے کے لئے ڈھول بجتی ہے
تو شہر کراہتا ہے۔"
راہ گیر کی باتیں سن کر اِن کدو[2] کا چہرہ سفید ہو گیا۔
"مَیں وہاں جاؤں گا جہاں گِل گامیش
لوگوں پر جبر کرتا ہے۔
مَیں اُسے للکاروں گا۔

---

[1] [2] سومیری داستان کے دو کردار

اور میری آواز ہر ایک شہر میں گونجے گی۔
میں پرانے نظام کو بدلنے آیا ہوں۔
کیونکہ میں سب سے قوی ہوں۔
پس آگے آگے دان کدو اور عورت اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔

کیا ہر کہانی کہنے کے لئے پلاٹ ہونا چاہیئے؟

اچھا تو سنو!

وہ تین مرتبہ مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آ چکے ہیں۔ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ میرا محبوب تھا۔ وہ مجھ سے پوچھتے ہیں۔

"کس جماعت سے اس کا تعلق تھا؟"

"سچ سچ بتا دو وہ کس سازش میں شریک تھا؟"

"اس کے منصوبوں میں کون لوگ اس کے ساتھ تھے؟"

میں دکھ اور غم سے پھٹ پڑتی ہوں اور ضبط نہیں کر پاتی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہوں۔ تب وہ مجھے یوں دیکھتے ہیں جیسے پکا ہوا لذیذ پھل ان کے سامنے رکھا ہو۔ میرے آنسوؤں کو میری کمزوری سمجھ بیٹھتے ہیں اور جھک کر بڑے دلاسے سے کہتے ہیں۔

"ہم جانتے ہیں کہ تم معصوم ہو۔ تمہارا کوئی دوش نہیں۔ بس ہمیں اس کے دوستوں کے نام اور اتہ پتہ بتا دو۔ تم سیدھی سادھی لڑکی ہو۔" وہ ہونٹوں پر زبان

پھیرتے ہوئے میرے حسن اور میری جوانی کو ننگی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

"ہم کوئی بچے لفنگے نہیں۔ عورت کی چادر کے محافظ ہیں۔ بتادو اُس بدمعاش کی سرگرمیوں کے بارے میں سب کچھ جس نے تمہیں اس جنجال میں پھنسایا ہے۔"

میں شرم اور غصّے سے سرخ ہو جاتی ہوں۔ بے اختیار دونوں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے باندھ کر اُن کی حریص نظروں سے اپنے سینے کو چھپانے کی کوشش کرتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ اب واپس نہیں آئے گا۔ میرا نگہبان اور محافظ! مگر کیا کوئی بلونت مجھے ان درندوں سے بچانے کے لئے نہیں اٹھے گا۔ جو اپنے جنم کے ساتھ ہوس اور بے حیائی کو اپنا مقدّر بنا کر لائے ہیں۔

ہاں میں اپنے کنوارپن کو بڑی منّتوں اور آرزؤں سے اُس کے بھینٹ کرنا چاہتی تھی۔ اُس کے لئے ایک نئے سنسار کو جنم دینے کے لئے بے چین تھی مگر وہ میری عصمت کا محافظ! ———— میری عزت کو کسی نرم و نازک خوشبو کی طرح اپنے دل میں بند رکھتا تھا۔ میں جانتی ہوں وہ مجھے گلے لگا کر کیا سوچتا تھا۔ وہ خواب دیکھتا تھا اُس سمے کا جب بے دھڑک مجھے اپنے بچّوں کی ماں کا روپ دے سکے اور اب میں اس کی راکھ ہاتھوں میں تھامے بیٹھی ہوں۔ غمزدہ اور نامراد!

میں لائبریری میں نوٹس تیار کر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے بہت قریب آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے سر اٹھایا وہ بانکا سجیلا، شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ عجیب سی چمک تھی اس کی آنکھوں میں۔ میں نے گردن جھکا لی۔ سارے جسم کا خون میرے چہرے اور سر میں جمع ہو گیا تھا۔ کچھ توقف کے بعد میں نے پھر اوپر نظر کی وہ مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ڈھٹائی سے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھ میز پر ٹکا دیئے۔

"کتنا بدمعاش ہے۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

میں کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ لائبریری میری جاگیر نہیں تھی۔ میں کتابیں سمیٹ کر اٹھنے لگی۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ اور میرے ہاتھوں سے کتابیں لے لیں۔

"بہت بھاری ہیں میں لئے چلتا ہوں۔" میں کٹھ پتلی کی طرح اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئی۔ میں نے پہلے بھی اسے دیکھا تھا مگر اتنے غور سے نہیں۔ لڑکیاں کہتی تھیں وہ بہت شوخ، ہرجائی اور کھلنڈرا ہے اور پھر بھی اس پر دم دیتی تھیں۔ میں ایسے لوگوں سے بہت ڈرتی تھی، مگر اس وقت میں اس کے پیچھے پیچھے کینٹین میں چلی آئی۔ وہ بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے باتیں کرنے لگا۔ اس میں مجھے کوئی بدمعاشی دکھائی نہیں دی۔ پھر ہم ملنے لگے۔

بہت بے چینی سے، بڑے پیار کے ساتھ ہم گھومتے، ہنستے، قہقہے لگاتے اور آنے والے وقت کا خیال کر کے خوشی سے سرشار ہو جاتے۔ وہ بہت اچھا ناچتا تھا۔ اُس نے مجھے بھی سکھا دیا۔ ہم رات رات بھر رقص کرتے، موسیقی سنتے اور ایک دوسرے میں مست رہتے۔

"جانتی ہو ہمارے ملک میں تفریح کا لطف اتنا پھیکا کیوں ہے؟"

"کیوں ہے؟"

"بہت سی وجوہات ہیں مگر سب سے بڑی وجہ یہ کہ عورت اور مرد ساتھ ساتھ تہذیبی سرگرمیوں میں حصّہ نہیں لے پاتے۔ کھُل کر نہیں رہتے۔" وہ دونوں ہاتھوں سے میرے کندھے تھام کر کہتا۔ "ہم دونوں بہت کچھ بدل دیں گے مل کر۔ ٹھیک ہے نا!"

"اس روشن خیالی کے ساتھ تم یہاں کس طرح جی سکو گے۔" میں کانپ کر سوچتی اور خاموش رہتی۔ وہ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتا تھا۔ اُس کا دل کسی روشن دن کی طرح شفاف تھا۔ لاابالی مگر غیر ذمہ دار نہیں۔ کبھی کبھی بہت بے چین ہو جاتا تو میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیتا۔ اور آنکھیں بند کر لیتا۔

"آؤ ہم شادی کر لیں۔" میں ضبط نہ کر پاتی۔

"ابھی نہیں۔"

"کیوں جی — ہم ایک دوسرے کو اتنا چاہتے ہیں"

"تمہیں کہاں رکھوں گا؟"

"ہم گھاس پر رہیں گے۔ درختوں کے نیچے اُن کی ٹہنیوں پر۔ پرندوں کی مانند مگن اور آزاد۔ ایک دوسرے پر اتراتے ہوئے" میں بہت رومینٹک تھی۔

"تم تھک جاؤ گی۔ بہت نازک ہو۔ میں تمہیں ——— میں تمہیں ——— " وہ بے قابو ہو کر مجھے اپنی باہوں میں جکڑ لیتا۔

ہم دونوں کم عمر تھے۔ ساری زندگی ہمارے سامنے کسی وادی میں مہکتے شاداب پھولوں کی طرح کھلکھلا رہی تھی۔ ہمارے انگ انگ میں قوت، ہمت اور جوانی بھری ہوئی تھی۔ ہمیں سب کچھ اپنے جذبوں کی طرح حسین اور اچھوتا معلوم ہوتا تھا۔ سمندر کی لہروں کی طرح پُرجوش اور بے کراں۔

ہاں سنو! میں یہ سب کچھ تمہیں بتا رہی ہوں مگر ان درندوں کے سامنے پھر خاموشی کی مورت بن جاؤں گی۔ جو میرے شباب کی شعاعوں سے اپنی نرسی خواہشوں کو سینکنا چاہتے ہیں۔ میں جانتی ہوں تم مجھے ان کے حوالے نہیں کرو گے۔ بچا لو گے نا؟ ——— وہ بھی تو کتنی حسرتیں اور ارمان لئے تمہیں بچانے کے لئے جل مرا۔

جب سے ملک کے حالات بدلے تھے ——— سختیاں بڑھی

تھیں وہ سوچتے سوچتے زرد ہو جاتا تھا۔ اس کی شوخی اور متوالا پن سب ختم ہو گیا تھا۔ وہ رات رات بھر بے چینی سے ٹہلتا رہتا تھا۔ ہم سمندر کے کنارے گھوم رہے تھے۔ قریب سے ایک گدھا گاڑی گذری۔ اس میں شور مچاتے، دانت نکالے، ہلڑ بازی کرتے دس بارہ آدمی سوار تھے۔ اور کمزور جھکے ہوئے خچر کو چابک مار مار کر تیز بھگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی پیٹھ پر، کمر کے نیچے گردن پر کئی جگہ سے کھال پھٹ گئی تھی اور اب وہاں سے خون رس رہا تھا۔ غریب جانور بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ وہ دائیں بائیں نظریں گھما کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بس سیدھی سڑک پر کسی نہ کسی طرح اُس بار کو جو اُس پر لدا تھا اٹھا کر چلتے رہنا چاہتا تھا۔

"جانوروں کو سدھاتے دیکھا ہے کبھی ؟" —— اس نے سوال کیا۔ "سدھانے کے لئے پہلے انہیں خوب مارتے ہیں۔ مار کھا کر وہ دُم ہلاتے انتہائی فرماں برداری سے مارنے والے کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور چابک تھامنے والے ہاتھ سے روٹی کھانے لگتے ہیں۔ کیا ہم ایسے نہیں ہیں ؟ جو ہاتھ ہمیں پیٹتے ہیں انہیں کو ہم مضبوط کر رہے ہیں ۔"

"ظلم کے خلاف جو نفرت پھیل رہی ہے اُسے تم کیوں نہیں دیکھتے ؟"

"اُس نفرت کا اظہار کیوں نہیں ہوتا ؟" —— سمندر کی دیوار پر وہ

دھم سے بیٹھ گیا۔

جوق در جوق مرد، عورتیں، بچے۔ سرِعام کوڑوں اور پھانسی کی سزائیں دیکھنے کے لئے میدان میں جمع ہوتے۔ بسوں اور ٹرکوں میں بھر کر وہاں پہنچتے۔ وہ دیکھ کر کانپ جاتا۔ ایسا لگتا جیسے اُس کا جسم کھنچ کر دہرا ہو گیا ہے۔ وہ بوکھلاہٹ میں عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتا۔ اُس پر دورہ سا پڑتا۔

"رومیوں کے بارے میں پڑھا ہے نا کہ کھانے کو نہیں تھا جسم پر کپڑے نہیں تھے مگر "GLADIATORS" کو لڑتے۔ انسان کو شیر اور چیتے کا نوالہ بنتے ہوئے دیکھنے کے لئے پورا شہر امنڈ پڑتا تھا۔ ایک دوسرے کو دھکے دیتے، کچلتے، چیختے، چلاّتے، گالیاں اور خرافات بکتے یہ لوگ کن حدوں پر پہنچے ہوئے تھے اور دیکھو آج ہمارے سامنے سب کچھ ہو رہا ہے۔ اخبار والے سرخیاں لگاتے ہیں دو لاکھ کے مجمعے نے کوڑے لگتے دیکھے تین لاکھ کے ہجوم نے پھانسی لگتے دیکھی مگر کوئی اداریہ نہیں لکھتا کہ یہ سب کتنا انسانیت سوز ہے۔ آدمی کو یوں نہ گراؤ۔ ڈاکٹروں کی جماعتیں انسانی جسم پر ان سزاؤں کے جان لیوا اثرات پر روشنی نہیں ڈالتیں۔"

وہ کنپٹیاں دبانے لگتا۔ چند مہینوں میں ہی اس کے ریشمی گھنگھریالے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ چہرے کی صحت مند جھلملاتی جلد پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔ وہ بہت حساس تھا۔ دوسروں کے دکھ درد پر کڑھنے کے

بجائے جھٹ اُن کی مدد کرنے کھڑا ہو جاتا۔ کتنی مرتبہ اُسے دوسروں کے لئے نقصان اٹھانا پڑا۔ لڑنا پڑا، چوٹ کھانی پڑی۔ مگر وہ اسی طرح کا تھا۔ میں روکنا چاہتی تو بپھر جاتا۔ میں سہم کر خاموش ہو جاتی۔ اُسے اپنے فائدے اور بھلائی کی باتیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔

"جانتی ہو اخلاقی مجرم اپنے کسی ساتھی قیدی پر ہونے والے ظلم و ستم کو کبھی اس طرح محسوس نہیں کرتے اُس پر احتجاج نہیں کر سکتے۔ ہم سب بھی کہیں اخلاقی مجرم تو نہیں ہیں۔ ایک دوسرے پر کیے جانے والے ظلم کو برداشت کیے جا رہے ہیں ——— کیے جا رہے ہیں۔"

"تم اتنی شدت سے اپنے آپ کو نہ جلاؤ" ——— میں نے اُسے تشویش سے دیکھا۔

"جلاتا ہوں؟ میں تو سلگ رہا ہوں۔ دیکھو ذرا۔ یہی لوگ ——— ہاں یہی ——— چند ماہ قبل سیاسی جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ گلیوں میں نعرے لگاتے گھومتے تھے۔ دوکانیں بند کرواتے تھے، ہڑتالیں کرواتے تھے۔ جھنڈے اٹھائے گلیوں گلیوں ترانے گاتے پھرتے تھے اور اب یہی لوگ ڈرامے لگتے دیکھنے کے لئے جمع ہوتے ہیں، کرکٹ میچ، ہاکی میچ دیکھنے کے لئے بھیڑ لگاتے ہیں۔ کیا ہم سب بھیڑ لگانے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں؟ ——— آخر یہ سب ہے کیا؟" ——— وہ بڑی بے بسی سے سوال کرتا۔

پھر وہ اپنے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کے لیے اپنی تسکین کی خاطر سیاسی جماعتوں کی میٹنگوں میں جو چہار دیواری کے اندر ہو سکتی تھیں شریک ہونے لگا۔ دائیں بازو اور بائیں بازو، چھوٹی بڑی سب جماعتوں کے جلسوں میں جاتا۔ ایک امید اور آسرے کی تلاش میں سچائی اور جدوجہد کی خاطر۔

"باتیں — باتیں — باتیں" — وہ جھنجھلا کر مجھے بتاتا۔ "سب منتظر لگتے ہیں کہ کہیں سے کچھ ہو جائے گا کوئی تائید غیبی، کوئی باہر والا یہاں آ کر مل چلوائے گا، اور پھر ایک سرے سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے؟" — وہ دل برداشتہ ہو کر کہتا۔

اور وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں — "بتاؤ اُس کا تعلق کس سیاسی جماعت سے تھا؟"

وہ پڑھے لکھے لوگوں کے جلسوں میں، ایسی ہر جگہ پہ گیا جن کے ساتھ مل کر کچھ کرنے کی امید تھی مگر کچھ نہیں — دعوے اور جھوٹ۔ جو جوشیلی تقریریں کرتے تھے۔ انہیں خود اپنے ایک لفظ پہ بھی بھروسہ نہیں تھا۔

"ہمارے ملک کا غریب کسان، مزدور کچلا ہوا طبقہ مٹی کے ڈھیلوں کی طرح شہروں میں حکمرانی کرنے والوں کے پیروں تلے پس رہا ہے، بے وقوف بن رہا ہے۔ فوج، پولیس اور نوکر شاہی کے ہاتھوں، سیاسی جماعتوں بڑے

لیڈروں، بجفادری عالموں اور مولویوں کے ہاتھوں ——"

"دیکھنا ایک دن مٹی کے یہ ڈھیلے سیسہ پلائی دیوار بن جائیں گے"
مَیں نے اُسے تسلی دینی چاہی۔

"کب آخر کب؟ —— جہاں جاؤ بس ایک ہی بات بھٹو کو پھانسی ہو گی؟ بھٹو کو پھانسی نہیں ہو گی" اُس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میری بات کا یقین کرنا چاہتا ہو۔

اور بھٹو کو پھانسی ہو گئی۔ سڑکوں پر سناٹا، گلیوں میں خاموشی۔ بوڑھے جذبے —— جھریوں دار سفید بالوں سے اٹی مردہ روحیں۔ یہ کیسا ملک ہے؟ یہ کیسے لوگ ہیں؟ —— روتے ہیں، آنسو بہاتے ہیں اور بس فاتحہ کیلئے ہاتھ اٹھا دیتے ہیں۔

"قبرستان تو نہیں ہے؟" —— وہ مجھ سے پوچھنے لگا۔ پھر خود ہی بولا۔
"مگر قبرستان کے سناٹے میں کتے تو بھونکتے ہیں کم از کم ——"
"تم کچھ کیوں نہیں کرتیں؟" —— اُس نے خوفناک نظروں سے مجھے گھورا۔

"کیا کروں؟" —— مَیں بے بسی سے ہاتھ گود میں رکھے بیٹھی رہی۔

"سب یہی کہتے ہیں کیا کروں؟ —— میں ایک بات بتاؤں۔ سب

اپنی اپنی جگہ مطمئن ہیں۔ میری گاڑی، میرا پٹرول، میرے بچے اچھے اسکول میں پڑھ لیں، میرا ریفریجریٹر کھانوں سے بھرا رہے۔ مجھے علاج کی سہولتیں ملتی رہیں میری آمدنی بڑھتی رہے پھر سب ٹھیک ہے۔"

"یوں کڑھنے کا فائدہ بھی کیا؟" ــــ میں نے ہمت کر کے کہا۔ وہ ہلکی پھلکی گفتگو کا عادی تھا۔ اب اتنی سنجیدہ باتیں اس کے منہ سے سن کر میں بڑی وحشت محسوس کرتی تھی۔

"فائدہ ــــ فائدہ ؟ مجھے نہیں معلوم جلنا مرنا، آنسو بہانا اپنے اندر بھری محبت اور خلوص کی آگ میں جھلسنا اس کا کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ کیا جذبے بھی ترازو میں وزن کئے جا سکتے ہیں؟"

اب اُس کی حالت ناقابل برداشت تھی۔ وہ کچھ کرنے کے لئے بے چین تھا۔ جان ہتھیلی پر لئے گھوم رہا تھا۔ کہیں سے کوئی آواز اٹھے اور وہ اس میں شامل ہو جائے۔ لوگوں کو جھنجھوڑ ڈالے ــــ اٹھو اٹھو ــــ اس دیوار کو توڑ دو ــــ ہاتھوں سے، پیروں سے، سر سے، پورے جسم سے ــــ آؤ طاقت لگاؤ ــــ مل جاؤ ــــ مگر دیوار کو توڑنے کے بجائے سب اُسے اپنے آنسوؤں سے سینچ رہے تھے۔ اتنی مہنگائی، بیروزگاری، جہالت، دھاندلی، ناانصافی، رشوت ــــ خدایا اتنی بے حسی کیوں؟ ــــ اُس نے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ محض ٹھٹھہ بازی اور باتیں یہاں کی وہاں کی ــــ سیاسی

گفتگو، مسائل پر۔ بات چیت سے لوگ بچنے لگے تھے۔ جیسے اپنے اپنے گناہوں اپنی اپنی بداعمالیوں اور بے عملیوں کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہوں ایک دوسرے کو مجرم سمجھ رہے ہوں۔ بزدلی اور بے حسی انتہا پر پہنچ جائے تو شائد ایسا ہی ہوتا ہے۔ اعتبار اور بھروسے کی جگہ شک و شبہ، نفرت اور عداوت یہ جذبے حاوی ہو جاتے ہیں۔

"آؤ شہر کے باہر چلیں"—— اُس نے بہت بجھ کر بیزاری سے کہا۔

"تم کتنے بدل گئے ہو؟"—— مہینوں کے بعد ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہے تھے، شہر سے بہت دور نیشنل ہائی وے سے دو میل اندر کی طرف جہاں چونسے کے ذخیرے ہیں وہاں قریب ہی ایک پرانے شہر کے کھنڈر ہیں ہم وہاں چلے گئے تھے۔ اُس نے قریب اُگی جھاڑی میں سے ایک آتشی رنگ کا جنگلی پھول توڑ کر میرے بالوں میں سجا دیا اور پھر آہستہ سے میرا سر چوم لیا۔

"تمہارے سر میں آگ لگی ہے"—— پھیکی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

"آؤ اس آگ کو بجھائیں"—— وہ میرا ہاتھ تھام کر گہرے تالاب میں اتر گیا۔

تالاب بہت لمبا چوڑا تھا۔ کئی جگہ سے اینٹیں اکھڑ گئی تھیں مگر پتہ چلتا تھا کہ خوبصورت اور پُر رونق رہا ہوگا۔ وہ بڑی شان سے تالاب کے اندر چلتا رہا۔ اینٹوں کے بیچ میں بنے ہوئے پانی کی نکاسی کے راستوں کو جھانک جھانک کر دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور دونوں ہاتھوں کو اس طرح ہلانے لگا جیسے تیرتے ہوئے پانی کو کاٹ رہا ہو۔

"میں نے تمہیں تیرنا سکھایا ہے ؟" ــــ اُس نے آنکھیں بند کئے کئے پوچھا۔

"ہاں ــــ آں ــــ میں تیرنا جانتی ہوں"۔

"شاباش ! اب تم نہیں ڈوبو گی" ــــ وہ خوش ہو گیا ــــ "مجھے تمہاری بہت فکر تھی"۔

میں چاہتی تھی وہ مجھے چومے، پیار کرے اور سب کچھ بھول جائے۔ میں اس کے قریب کھڑی ہو گئی اتنی قریب کہ میری سانسیں اُس کی گردن سے ٹکرانے لگیں۔ مگر وہ آنکھیں بند کئے کھڑا رہا اور اُسی طرح ہاتھ چلاتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچ گیا۔

"مجھے ایک نامعلوم راستے پر چلنا ہوگا۔
اور ایک انوکھی جنگ لڑنی ہوگی۔
پس میری روانگی کے دن سے میری واپسی کے دن تک
میرے چندن کے جنگل میں داخل ہونے سے

اور بھیانک بلا کو جس سے شمس نفرت کرتا ہے۔
ہلاک کرنے تک۔
میرے حق میں دعا کرتی رہنا۔
شمس! تُو نے میرے بیٹے کو بے چین دل کیوں دیا؟
ہاں کیوں دیا ہے؟"

"دیکھا میں آنکھیں بند کئے کئے سیڑھیوں تک آ گیا" اُس نے تالاب سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

"بھلا اس شہر میں کون لوگ رہتے ہوں گے؟" —— سامنے خشک جھیل تھی اور کنارے پر شہر کے کھنڈر۔ ایک جانب ٹوٹا ہوا مندر تھا اور دوسرے سرے پر مسجد اور اس کی محرابیں۔

"یہ ملی جلی آبادی والا شہر تھا"

"ہاں!"

"آؤ ہم مسجد میں سجدہ کریں اور مندر میں پوجا" —— اُس نے پوجا کے لئے جنگلی پھول توڑ لیے۔

مندر کے ارد گرد بڑا پُر اسرار ماحول تھا۔ دیواروں پر مٹے مٹے حروف میں کہیں کہیں اوم لکھا نظر آتا تھا۔ پانی کے زور سے کٹی ہوئی چٹانوں کے بیچ میں تنگ، پیچیدہ راستے اور ان میں اُگے ہوئے پیڑ، جنگلی پودے اور اُونچی اُونچی گھاس۔

"یہاں کوئی خزانہ دفن ہوگا"

"اور اُس پر ایک بڑا سا اژدہا کنڈلی مارے خزانے کی حفاظت کرتا ہوگا۔"

"حمبابا[1] کو ان کدو نے ہلاک کیا تھا۔
اور چیندن کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔
یہ کام اِن کدو کا تھا۔
اُس نے عظیم دیوتاؤں کے پوشیدہ مسکن کو عریاں کیا تھا"

"آؤ اژدہے کو ماریں" —— اس نے ایک پیڑ سے لکڑی توڑی۔

"لکڑی سے مرجائے گا سانپ ؟"

"لکڑی کے سرے پر آگ لگادیں گے۔ مرے گا نہیں تو بھاگ جائے گا"

"آخر آگ ہی کیوں ؟"

"اِس لیے کہ آگ علامت ہے پاکیزگی، قربانی، بے لوثی اور علم کی
پرومتیھوس نے آگ چُرا کر انسان کو عقل کے آسمان پر بٹھادیا اور دیوتاؤں سے کڑی سزا پائی۔ بدھ کو نرِوان ملا تو آگ دکھائی دی —— موسیٰ نے آگ کے

---

[1] سومیری داستان میں ایک بلا۔

ساتھ پیغمبری پائی ــــــ ابراہیم ــــــ"

"دیکھو اس شہر کو بھی شاید آگ لگی تھی تب ہی اجڑ گیا" میں نے جلی ہوئی اینٹوں کی جانب اشارہ کیا۔

"آؤ ہم بھی اپنے شہر کو آگ لگا دیں۔ جو کچھ فرسودہ، تباہ کن اور بے جان ہے اُسے جلا دیں۔ ایک نئے شہر کی بنیاد رکھیں جہاں خوشیاں، آرزوئیں اور تمنائیں ــــــ قوت اور توانائی بن کر ابھریں" ــــــ مسجد نسبتاً نئی تھی۔ نقشی اینٹوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ شہر بہت پرانا نہیں ہے محرابوں کی جھڑی ہوئی اینٹوں پر مٹی مٹی قرآنی آیتیں کھدی تھیں ہم دونوں ان دیواروں محرابوں اور طاقوں میں رکھے چراغوں کو دیکھتے رہے جو آنے جانے والے کبھی کبھار یہاں روشن کر جاتے ہوں گے۔ اب شام کی سُرخی آہستہ آہستہ رات کی کجلاہٹ میں گھل رہی تھی۔ آسمان پر پورا چاند چمکنے لگا تھا۔

"چلو چلیں مجھے ڈر لگ رہا ہے"

"کس سے ؟ میرے ساتھ بھی ڈرتی ہو؟" ــــــ وہ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر پتھروں کے اوپر لیٹ گیا اور آسمان کو تکنے لگا۔

"چاند جو یہاں سے اتنا ٹھنڈا اور میٹھا لگ رہا ہے سوچو کس قدر شدت سے تپ رہا ہو گا تب ہمارے پاس یہ ٹھنڈی خوشگوار چاندنی پہنچتی ہے۔ اگر ایک انسان بھی سلگنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو ہزاروں دلوں

میں ٹھنڈک اور طمانیت بن کر اتر سکتا ہے"۔

"ہاں!"

"خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو
خونِ دل نذرِ چمن بندیٔ دوراں کر دے"۔

وہ لیٹے لیٹے اپنے چہیتے شاعر کے مصرعے گنگنانے لگا۔ میں خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"مجھے وحشت ہو رہی ہے" —— میں نے گردن اٹھا کر کہا۔

"آگ کو کس نے گلستاں نہ بنانا چاہا
جل بجھے کتنے خلیل آگ گلستاں نہ بنی"

"تم اٹھتے کیوں نہیں؟ گھر چلیں"

"ٹوٹ جانا درِ زنداں کا تو دشوار نہ تھا
خود زلیخا ہی رفیقِ مہِ کنعاں نہ بنی

یہ بھی تو گھر ہے" —— اُس نے کھنڈر کی جلی ہوئی اینٹوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ دیواریں ہم پر گر تو نہیں رہیں" —— پھر وہ اچانک سیدھا کھڑا ہو گیا اور مجھے جھٹکے سے اپنے قریب کر لیا۔ دائیں ہتھیلی کی پشت سے اُس نے میرا چہرہ اوپر اٹھایا۔ وہ مجھ سے سر برابر اونچا تھا۔ میں گردن اٹھا کر اُسے دیکھنے لگی۔ اُس کی بے حد حساس نظریں مجھ پر گڑی تھیں۔ جیسے بہ کچھ

ڈھونڈ رہی ہوں۔ وہ بہت دکھی لگتا تھا۔ اُس لمحے مَیں مندر کے کسی پیچدار راستے میں گم ہو کر ہمیشہ کے لئے مر سکتی تھی۔

"اب ہمیں چلنا چاہیئے۔ کیا مَیں نے تمہیں بہت پریشان کیا ہے" —— وہ بڑے پیار سے بولا۔

"نہیں ابھی کچھ دیر اور رکو" —— اب مَیں ٹھہرنا چاہتی تھی۔

"سانپ نکلنے لگیں گے تھوڑی دیر میں"۔

"تو کیا ہُوا تم انہیں جلا دینا" —— مَیں نے مسکرا کر بڑے اعتماد سے کہا۔

"یہ ہمارا کیا بگاڑتے ہیں؟ اس ویرانے کو آباد کر رکھا ہے انہوں نے۔ آؤ ہم اپنے شہر کے سانپ جلائیں"۔

سہارا دے کر اُس نے مجھے جیپ کی اگلی نشست پر بٹھا دیا۔ ہم دونوں نے راستے بھر کوئی بات نہیں کی۔ مَیں اسے غور سے دیکھ رہی تھی کبھی اُس کے ہونٹ بھنچ جاتے، گردن کی رگیں تن جاتیں، ہاتھ اسٹیرنگ پر سختی سے جکڑ لیتا۔ کبھی بالکل ڈھیلے چھوڑ دیتا۔ کبھی پیشانی پر ایک ساتھ بیشمار لکیریں ابھر آتیں، کبھی پُر سکون ہو جاتا۔ یوں لگتا تھا۔ جیسے پورے جسم کے ساتھ سوچ رہا ہو۔ مجھے اتار کر وہ خود بھی دروازے تک میرے ساتھ چلتا

ہوا آیا۔

"تم ایک آدمی کی قربانی میں یقین رکھتی ہو ؟"

"میں اِس وقت کچھ سوچنا نہیں چاہتی۔"

"سوچنے کا وقت اب ہے کہاں۔ مگر ایک بات بتاؤ۔"

"کیا ؟"

"جب سب کچھ ناقابل برداشت ہو جائے، اپنا وجود ایک عذاب معلوم ہونے لگے اور عمل کی راہیں گنجلک ہوں تو اُس لمحے روشنی کی ایک جھلک کیا دوسروں کو راستہ نہیں دکھا سکتی ؟"

"اور وہ روشنی کہاں سے آئے گی ؟"

"کہیں سے بھی —— کسی بدن سے، کسی دل سے، کسی ذہن سے، لمحے بھر کو ہی سہی، مگر افیون کا نشہ توٹے گی۔"

"اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ تم سو جاؤ جا کر۔ ہم کل ملیں گے۔" مَیں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں اب مجھے بھی سو جانا چاہیئے" —— اُس نے لمحے بھر کے لئے مجھے دونوں ہاتھوں سے تھاما، بڑی حسرت سے دیکھتا رہا پھر بہت آہستہ سے پھول کی طرح میرے ہونٹ چُوم لئے۔

دروازے کی چوکھٹ سے سر ٹکائے مَیں بے خود سی کھڑی تھی۔

جب اُس کی جیب کی بتّی میری آنکھوں پر پڑی - مَیں چونک کر جاگ اٹھی۔

"اپنا خیال رکھنا" ——— مَیں نے دوڑ کر کہا ——— اس نے ہنستے ہوئے ہاتھ ہلایا اور ہوا ہو گیا۔

"پہاڑ گرا۔
اور اُس نے مجھے زخمی کیا اور میرے پاؤں نیچے سے پکڑ لئے۔
تب آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی روشنی نمودار ہوئی۔
اور اُس کی چمک دمک حسنِ عالم سے بڑھ کر تھی۔
اُس نے مجھے پہاڑ تلے سے نکالا اور پینے کے لئے پانی دیا۔
اور میری ڈھارس بندھائی اور مجھے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔"

"تم نیک اور بھولی معلوم ہوتی ہو تم کو یقیناً ملک و قوم کی بہتری کے لئے بتانا چاہیے کہ اُس کا تعلق کس گروہ سے تھا - وہ کن لوگوں سے ملتا جلتا تھا" ——— چکنے چپڑے، دُنبے کی دُم کی طرح موٹے تازے، پلے بڑھائے، ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے ڈنڈے تھامے، ٹہلتے ہوئے یہ بے حس لوگ کس بے شرمی سے مجھ سے سب کچھ پوچھ رہے ہیں ——— اور مَیں اس کے جوالا مکھی کی راکھ کو مانگ میں سجائے ہاتھوں میں تھامے بیٹھی ہوں۔

کیا تم مجھے بچا لو گے ؟ یہ راکھ پھیلانے کے لئے کون اٹھے گا اِس شہر سے ؟ ——— جس کی کھوکھلی بنیادوں میں وہ اپنی آگ بھر دینا چاہتا

تھا ——— اور میرا اکلاپن ؟ —— میری بند کوکھ میں سوئے پھول ہمیشہ کے لئے مرجھا جائیں گے ؟

"ابھی میرے گھر میں چتا کی آگ نہیں جلے گی۔
اور نہ میری لاش کو نذرِ آتش کیا جائے گا۔
آج اگر تو میری اعانت کرے۔
اور میں تیری اعانت کروں۔
تو پھر ہمیں کون ضرر پہنچا سکے گا۔
اپنا تیشہ سنبھال اور پرورش کر
وہ جو جنگ کو نا تمام چھوڑ دیتا ہے کبھی سکون نہیں پاتا۔"

کوئل اور جنرل

سہ پہر میں کام ختم کر کے جنرل اپنے آفس سے نکلا اور گھر جانے سے پہلے اُس اونچے چبوترے پر ذرا دیر کے لئے آکر کھڑا ہوا جو گھر اور آفس کے بیچ میں وسیع لان پر بنا تھا۔ ڈیوٹی پر تبدیل ہونے والے گارڈ نے جنرل کو سلامی دی، فوج کا بگل بجا، اُسی لمحے کوٹھی کے چاروں طرف آم کے اونچے اونچے پیڑوں پر، جو بوروں سے لد گئے تھے کوئل نے اُڑتے اُڑتے مست ہو کر تان لگائی —— "کوُ و و و —— "

جنرل نے بھنوئیں چڑھا کر اُوپر دیکھا مگر آسمان تیز چُندیا دینے والی دھوپ سے بھرا تھا۔ وہ اپنی چھڑی کو بغل میں دبائے تیز تیز قدموں سے گھر کی جانب چل دیا۔

اردلی نے دروزاہ کھولا، جنرل کا تازہ سفید سیوٹلین سوٹ، سفید

جوتے، سفید موزے تیار رکھے تھے۔ ہلکی سی خوشبو لگا کر وہ باہر نکلا تو اس کی بیوی ہلکے گلابی ساڑے میں تازہ تازہ دھلی دھلائی تیار کھڑی تھی۔ دونوں بچے اپنی سجی بنی تعلیم یافتہ آیا کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔ جنرل نے سوالیہ نظروں سے بچّوں کی طرف دیکھا۔

"میں نے سوچا اسکول کا فنکشن ہے اور ——"

"اچھا اچھا!" جنرل نے بیوی کی بات کاٹ دی۔ اسے لمبے چوڑے جواب اور وضاحتیں سننے سے الجھن ہوتی تھی۔ بچّے اتنے تندرست خوبصورت اور تمیزدار تھے کہ ان کی موجودگی عموماً لوگوں کے دل اُس کے لئے جیت لیتی۔

بڑی سی چھ دروازوں کی مخصوص مرسڈیز جس پر فوج کا جھنڈا لہرا رہا تھا اسکول کے پھاٹک میں داخل ہوئی تو شامیانے کے نیچے منتظر بینڈ نے ایک فوجی دھن چھیڑ دی۔ اسکول کی شاندار عمارت کے سرے پر کھیل کے میدان میں پرنسپل اور گورننگ باڈی کے عہدے دار جنرل اور اس کی بیوی کا استقبال کرنے کے لئے کھڑے تھے۔ بچیوں نے گارڈ آف آنر پیش کیا بینڈ کی دھن پر جنرل، جنرل کے پیچھے اس کی بیوی اور سفید کپڑوں میں اسکول کی دبلی پتلی پرنسپل اور دوسرے لوگ فوجی انداز میں قدم بڑھاتے سامنے رکھے صوفوں تک آئے۔ پچھلی نشستوں پر بیٹھے دوسرے مہمان جنرل کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ دو بچیوں نے جنرل اور اس کی بیوی

کو سرخ گلاب کے بڑے بڑے گلدستے پیش کئے۔

اب لڑکیاں، مارچ پاسٹ کر رہی تھیں۔

"لیفٹ رائٹ"

"لیفٹ رائٹ"

"لیفٹ"

"لیفٹ"

"لیفٹ" ——— آج جنرل نے لیفٹ سے تعلق رکھنے والے بہت سے نوجوانوں اور طالب علموں کی سزاؤں کے فیصلوں کی توثیق کی تھی۔

"تیسرے کوڑے کے بعد بہت گاڑھا گاڑھا خون نکلتا ہے بالکل آپ کے سامنے رکھے گلاب کے ان سرخ پھولوں کی طرح سمجھ میں نہیں آتا ان دبلے پتلے کمزور آدمیوں میں اتنا رنگ دار خون کہاں سے آتا ہے"۔ سزاؤں کی تکمیل کے بعد ایک میجر نے تفصیل سناتے ہوئے کہا تھا۔

جنرل نے لمحے بھر کے لئے سرخ گلاب منہ کے قریب لا کر سونگھے اور پھر میز پر رکھ دیئے۔

"اب قومی ترانہ ہوگا اور پرچم لہرانے کی تقریب" اناؤنسر

نے کہا۔

سب با ادب کھڑے ہو گئے۔ جنرل ایک اسکاوٹ کے ہمراہ پرچم کے اسٹینڈ کی طرف چلتا ہوا آیا۔ ترانہ ختم ہو رہا تھا۔ لپٹے ہوئے پرچم کو کھولنے میں کچھ دِقّت پیش آ رہی تھی۔ کہیں کوئی گرہ سی اٹک گئی تھی۔ اسکاوٹ نے ذرا زور سے جھٹکا دیا تو جھنڈا اُس کے ہاتھوں کھل گیا اور اُس میں لپٹی گلاب کی معطر پتیاں ڈھیر کی شکل میں زمین پر گر پڑیں۔ ترانہ ختم ہوا۔ جنرل نے پرچم کو سیلوٹ کیا۔ اسی لمحے ہوائی فائر کا تڑاخہ ہوا اور فضا میں رنگ برنگے نیلے۔ اودے۔ لال پیلے غبارے پھیل گئے۔ جنرل نے اوپر دیکھنے کی کوشش کی مگر دھوپ بہت تیز تھی اسے اینٹی ایر کرافٹ گن سے لال پیلے شعلے نکلتے محسوس ہوئے۔ نیچے رِنگ ریس میں حصّہ لے رہے تھے۔

طالب علموں کے رنگ لیڈر ہتھکڑیاں پہنے فوجی عدالتوں کے سامنے سزا کے انتظار میں کھڑے تھے۔

سفید برّاق کپڑوں میں بچّیاں جسمانی ورزش کے مظاہرے کر رہی تھیں۔ مائیکروفون پر ورزش کی تربیت دینے والی امتحانی موسیقی کی

دھن پر ہدایات دے رہے تھیں۔

JOIN HANDS AND MAKE LINES

(ہاتھ تھامو صفیں بناؤ)

سڑکوں پر فوجی جیپ سے اعلان ہو رہا تھا۔

TAKE ARMS AND BREAK THE LINES.

(ہتھیار اٹھاؤ اور صفیں توڑ دو)

استانی کہہ رہی تھیں۔

ONE TWO, ONE TWO, HANDS UP.

(ایک دو، ایک دو، ہاتھ اُوپر)

ایک دم سیکڑوں ننھّی منّی تالیاں بج اٹھیں۔ جیسے بہت سے کبوتر ایک ساتھ پھڑپھڑا کر اڑ گئے ہوں۔

فوجی جیپ سے اعلان ہو رہا تھا۔

ONE TWO, ONE TWO, FIRE.

(ایک دو، ایک دو، فائر)

ایک ساتھ سڑک پر بہت سی لاشیں تڑپ رہی تھیں۔

اس سے پہلے کہ میں اسکول کے پچھلے سال کے کارناموں کی تفصیل

میں جاؤں بہتر ہے کہ آج کی دنیا میں دی جانے والی تعلیم اور اُس کے مقاصد کی ایک مختصر شکل پیش کروں۔"

پرنسپل کی عالمانہ آواز مائیکروفون پر گونجی۔"تعلیم پانے کا مقصد محض ڈگریاں حاصل کرنا نہیں ہے۔ بہت سے لوگ بڑی بڑی ڈگریاں لے کر بھی جاہل رہتے ہیں۔"

اہم شہریوں کا ایک وفد جس میں وکیل۔ ڈاکٹر، سیاستداں، ماہرین تعلیم، بینکر اور دانشور شامل تھے جنرل کے سامنے ہاتھ باندھے اپنی وفاداریوں اور شہریوں کی نمائندگی کا یقین دلانے کے لئے کھڑا تھا۔

پرنسپل کہہ رہی تھیں۔"تعلیم کا مقصد انسان کے اندر ایک صحت مند سوچ پیدا کرنا ہے۔ اور دوسرے انسانوں کی عزت کرنا ——"

جنرل نے شہر میں سرپھرے نوجوانوں کے ہنگاموں کی رپورٹ سُنی تو تھوڑی دیر خاموش رہا پھر دانت پیستے ہوئے حکم دیا۔

"ان حرامزادوں کی ایسی پٹائی کرو کہ یہ دوبارہ سر نہ اٹھا پائیں۔ انہیں ہماری طاقت کا اندازہ ہو جانا چاہیئے۔" پتلی سی بید سے وہ اپنے سینے پر سجے تمغوں کو بڑی نرمی سے تھپک رہا تھا۔

پرنسپل کہہ رہی تھیں۔"آپ کی بچیاں جب اس اسکول میں داخل

ہوتی ہیں تو یہ ہماری بچیاں بن جاتی ہیں۔ انہیں ایک بہتر اور خوش آئند مستقبل کے لیئے تیار کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اسی لئے ہمارے اسکول کا تعلیمی تہذیبی اور کھیل کا معیار اتنا بلند اور اطمینان بخش ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں اپنے بچوں کو ہمارے پاس داخل کرنے کے آرزومند والدین مایوس لوٹ جاتے ہیں۔"

جنرل نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کی دونوں بڑی بیٹیاں ملک میں گنتی کے چند ایسے اسکولوں میں سے ایک اسکول میں پڑھ رہی تھیں اور اگلے سال اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ جانے والی تھیں۔

کھیل کے میدان کی دیوار کے ساتھ گورنمنٹ اسکول کی ٹوٹی پھوٹی عمارت کی چھت پر بہت سے میلے کچیلے بچے میل بھرے ناخنوں کو دانتوں سے چباتے آنکھیں پھاڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

جنرل کی بیوی جیتنے والی بچیوں میں انعام تقسیم کر رہی تھی "آج کا رنگ سبز ہے" —— مائیکروفون پر اعلان ہوا۔ جن لڑکیوں کے گروپ کا رنگ سبز تھا انہوں نے سب سے زیادہ انعام حاصل کئے تھے۔ جنرل اطمینان سے ہاتھ کی انگلیاں صوفے کے ہتھے پر سجانے لگا۔ سڑک پہ سبز فوجی ٹرکوں کی لمبی قطار کے باعث سارا ٹریفک رک گیا تھا۔ اور اسکول تک اُس کے شور کی آواز آ رہی تھی۔

"مجھے پرنسپل صاحبہ کی بصیرت افروز تقریر نے بے حد متاثر کیا۔"
جنرل کی بیٹھی بیٹھی، ٹھہری ہوئی آواز گونجی۔ سفید جوتوں اور سفید سوٹ میں اس کا پلا ہُوا جسم، پھولے سرخ چہرے پر چوڑا جبڑا کھنچی آنکھیں اور ہونٹوں کے کناروں پر جمع درشتی یہ سب بہت نمایاں ہو گئے تھے۔ "اچھی تربیت کے لئے آزاد اور پُر حوصلہ ماحول کی بہت ضرورت ہے۔ مگر آزادی کو استعمال کرنے کا ایک طریقہ بھی ہوتا ہے جسے سمجھنا بہت ضروری ہے۔"

اسکول کے میدان کے سرے پر اُگے آم کے پیڑوں کی ہری بھری پتیوں پر کوئل کوکی۔ جنرل نے آنکھ چڑھا کر اوپر دیکھا، دھوپ کی تیزی ختم ہو گئی تھی بس اب اُجالا باقی تھا۔ دو تین سال کی ایک بچّی جس کے بالوں میں بڑے بڑے گلابی ربن بندھے تھے قریب کی ایک کرسی پر آکر بیٹھ گئی اور اپنے گدرائے ہاتھ کرسی کی پشت پر ٹکا کر کوئل کی نقل اتارنے لگی۔ بچّی کی ماں لپک کر پیچھے سے آئی، کچھ جھینپتے ہوئے جنرل کی طرف دیکھا اور بچّی کو گود میں اٹھا کر چلی گئی۔

رات کا کھانا ختم کر کے وہ سب ڈرائنگ روم میں آ گئے اور اپنے دن بھر کے کارنامے ایک دوسرے کو سنانے لگے۔

پھر کارٹونسٹوں اور گویوں کی بات چل نکلی۔ کون سا کارٹونسٹ کتنا اثر

کرتا ہے۔

بریگیڈیر کی بیوی اپنے بیگ میں سے بہت سی رنگ برنگی چکنی چکنی گولیاں نکال کر کچھ لڑکھڑاتے ہوئے قالین پر بیٹھ گئی۔

"گولیاں کھیلنے کا شوق مجھے بچپن سے ہے۔"

وہ گنگناتے ہوئے بولی۔

"اس کھیل کے ماہر تو ہم ہیں"—— جنرل قالین پر بچھی شیر کی کھال پر بیٹھ گیا۔ بریگیڈیر کی بیوی اور جنرل بڑے انہماک سے گولیاں کھیلنے لگے۔ جب ان کی گولیاں آپس میں ٹکراتیں تو دوسرے لوگ جو سرک سرک کر اب قالین پر اُن کے چاروں طرف دائرے کی شکل میں بیٹھ گئے تھے زور زور سے تالیاں بجانے لگتے۔

صبح کے چار بج رہے تھے۔ کھڑکی کے کھُلے پٹوں سے ہلکی تازہ ہوا کے ساتھ کوئل کی رسیلی آواز آئی۔ "کوُ ووو——"

جنرل کے ہاتھ سے گولی پھسل گئی اور نشانہ چوک گیا۔ بازی بریگیڈیر کی بیوی نے جیت لی۔ جنرل نے ناگواری سے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ بریگیڈیر نے جو یونیفارم میں ہی آگیا تھا اور اس لئے فرش پر بیٹھنے کے بجائے سامنے صوفے پر ٹیک لگائے کھیل دیکھ رہا تھا کونے میں رکھی بندوق اٹھائی اور کمرے کے باہر چلا گیا۔ پہلے اُسے خیال ہوا کہ پہرے پر موجود کسی سپاہی سے

کہہ دے پھر کچھ سوچ کر برآمدے کی سیڑھیاں اترتا ہوا باغ میں آگیا اور آم کی ہلتی پتیوں کو دیکھنے لگا۔ بہت اوپر ایک ہوائی جہاز جا رہا تھا۔ اس نے مہینوں سے گولی نہیں چلائی تھی۔ آج کل شکار پر جانے کا موقعہ بھی نہیں مل رہا تھا۔

آم کے پیڑوں کے قریب جا کر وہ رک گیا پھر بندوق اُوپر کر کے اُس نے گولی چلائی۔ فائر کی آواز گونجی۔ دوسرے لمحے ایک کانپتی ہوئی خوفزدہ کوئل ٹہنی پر سے اُڑی۔

"گاتی چڑیا" بریگیڈیر نے ایک آنکھ بند کر کے نشانہ باندھا۔

سفید چاندنی سے بھرے آسمان کے نیلے سمندر میں کوئل ایک چھوٹی سی ناؤ کی طرح ڈولی اور دوسرے لمحے اس کے سیاہ پر راکھ کی طرح بھُر بھُرا کر فضا میں بکھر گئے۔

"ایک ــــ دو ــــ تین ــــ چار پانچ چھ سات ــــ" حمید نے جھنجھلا کر آنکھیں بند کر لیں۔ تیز رفتار گاڑیوں کو آنکھوں اور انگلیوں کی گرفت میں لے کر گننا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے کانوں میں موٹروں اور ٹرکوں کے انجن کھڑکھڑاہٹ مچانے لگے تو کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس کر وہ گودام کی چہار دیواری سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔

حمید بندرگاہ کو شہر سے ملانے والی سڑک سے تھوڑی دُور ایک جھونپڑے میں رہتا تھا۔ اس کا باپ صبح کام پر چلا جاتا اور شام کو دیر سے لوٹتا۔ کھانا کھا کر وہ پھر باہر چلا جاتا۔ حمید نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ باپ کب واپس آتا ہے۔ اس سے چھوٹے تین بہن بھائی تھے اور آٹھ برس کا حمید ماں باپ کی نظروں میں بہت بڑا ہو گیا تھا۔

"حمید ـــ اُٹھ بیٹا ـــ نل سے پانی بھر لا" ماں صبح ہی صبح اُسے جگا دیتی ـــ حمید چارپائی کے کونے سے ایک آنکھ بھینچ کر ماں کو چولہے کے پاس چائے پکاتے اور آٹا گوندھتے دیکھتا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگتا۔

"اٹھتا ہے کہ آؤں ؟" ـــ اس مرتبہ ماں کے لہجے میں تلخی ہوتی۔ حمید آنکھیں ملتا آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کرتا۔ اُسے معلوم تھا کہ تیسری مرتبہ ماں کی آواز کے ساتھ ایک بیلن والا ہاتھ بھی اس کے اُوپر لہرانے لگے گا اور وہ مار پیٹ سے بہت گھبراتا تھا۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو مارنا بھی اُسے پسند نہیں تھا۔ جب وہ زیادہ تنگ کرتے اور ماں مصروف ہوتی تو وہ چپکے سے جھونپڑے کے باہر نکل جاتا اور پھر گھنٹوں گھوما پھرا کرتا۔

وہ چھ برس کا ہوا تو باپ نے اُسے قریب کے ایک میونسپلٹی اسکول میں داخل کر دیا۔ شروع شروع میں اسکول جانے پر خاصی پابندی رہی۔ ماں بڑے پیار سے ناشتہ کرواتی اور جی لگا کر پڑھنے کو کہتی۔ وہ اسکول سے واپس آتا تو اُس کے سامنے روٹی اور سالن کی پلیٹ رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھتی۔

"آج کیا پڑھا"

"ہمارے نبی سب سے آخری پیغمبر تھے" ـــ وہ بڑا سا نوالہ منہ

میں رکھتے ہوئے جواب دیتا۔

"اچھا ـــــ یہ تو میں نے تجھے پہلے ہی بتایا تھا" ماں اپنی معلومات پر فخر محسوس کرتے ہوئے کہتی ـــــ "اور کیا پڑھایا ہے"

"قائداعظم نے پاکستان بنایا، ہم سب مسلمان ہیں۔ ہمارا وطن پاکستان ہے" ـــــ وہ تیز تیز بولنے لگتا۔

"یہ سب تو وہ دن رات ریڈیو پر کہتے رہتے ہیں" ماں بے دلی سے کہتی۔

"اور گنتی سکھائی ـــــ اور یہ بتایا کہ ـــــ کہ دُنیا اللہ میاں نے بنائی ہے۔ اُس کی مرضی کے بغیر پتّہ بھی نہیں ہلتا"

اس مرتبہ وہ ماں کو مرعوب کرنے کے لئے کہتا۔

"اچھا ـــــ" وہ خاموشی سے برتن اُٹھانے لگتی۔

روز ہی ایک جیسی باتیں ہوتیں۔

"تُو روز ہی ایک جیسا سبق پڑھتا ہے؟" ماں نے ایک دن اُکتا کر پوچھا۔

"نہیں آج تو ایک نظم بھی سیکھی ہے" وہ اپنی ماں کو پڑھائی سے مطمئن ہوتا نہ دیکھ کر کچھ مُجرم سا محسوس کرتا۔

"کون سی نظم ہے" ماں نے پوچھا۔

"تعریف اس خُدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی کیا آسمان بنایا"
حمید نے گانے کے انداز میں شعر پڑھا۔

"ہُوں!" وہ چھوٹی بہن کو دُودھ پلاتے ہوئے بولی "جب پوری یاد کر لینا تو سب کو سُنانا"

آہستہ آہستہ اسکول جانے والے بچّے کے گرد جو ایک رومانی تصوّر تھا ختم ہونے لگا۔ اس کی خاطریں بھی کم ہو گئیں —— بقول ماں باپ وہ پڑھنا سیکھتا تھا نہ تمیز اور قاعدہ۔ حمید خود بھی چٹائیوں پر بیٹھے بیٹھے ایک جیسی خوشخطی کرتے کرتے اُکتا گیا تھا۔ دن میں ایک آدھ مرتبہ استانی سزا دیتیں کبھی پٹائی ہوتی اور وہ بستہ سمیٹ کر دوپہر کو گھر آجاتا اور پھر گھر کے کام کرتا یا باہر کھیلنے چلا جاتا۔ پھر ماں بیمار ہو گئی اور نہ جانے کب حمید کا اسکول جانا بند ہو گیا۔ اُسے گھر کا بہت سا کام کرنا پڑتا۔ چھوٹے بھائیوں کو بہلانا، دوکان سے راشن لانا اور پانی بھرنا —— اور دوسرے چھوٹے موٹے کام جو ماں کی صحت یابی کے بعد بھی اُس کے ذمّے لگ گئے۔ کسی کو پتہ ہی نہ چلا کہ کب اُس کا اسکول جانا خود بخود ختم ہو گیا۔

"کل سے اسکول نہیں جائے گا تو ٹانگیں توڑ دوں گا" —— کبھی کبھار باپ کو غصّہ آتا تو وہ ڈانٹ ڈپٹ کرتا۔ حمید ایک دو دن کے لئے اسکول آتا

اور پھر غائب ہو جاتا۔ کوئی پوچھنے والا ہی کب تھا ہے —— اور اب تو مہینوں سے اس نے اسکول کا رُخ بھی نہیں کیا تھا۔ کام کاج سے بچنے کے لئے وہ گھر سے نکل کر بڑی سڑک پر آجاتا۔

صبح بھاگم بھاگ ناشتہ کرتا اور گودام کی چہار دیواری سے لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ پھر سڑک پر چلنے والی ٹرکوں، بسوں، گاڑیوں اور ٹیکسیوں کو گِنا کرتا مگر وہ سب اتنی تیزی سے گزر جاتیں کہ حمید کی نگاہیں بہ مشکل ان کا پیچھا کر پاتیں۔

"نہیں گِنتا —— جاؤ" وہ اپنے پھُولے ہوئے گالوں کو اور پھُلا کر غصّے سے دیوار کی جانب منہ کر کے کہتا اور جھک کر روئی کے گالے اٹھانے لگتا۔

"یہ سب روئی اکٹھا کر کے بیچوں تو ضرور کچھ پیسے مِل جائیں گے" وہ فلسفیوں کی طرح سوچتا۔

"یا پھر ماں کو دے دُوں۔ وہ سردیوں کے نئے لحاف بنالے گی" وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی کٹوری میں روئی اکٹھا کر کے گھر جانے کا ارادہ کرتا مگر پھر اکتا کر ہاتھ جھاڑ دیتا۔

"کیا فائدہ! اتنے چکّر لگانے پڑیں گے۔ گھر سے سڑک تک جاں تو پیچھے ہی پڑ جائے گی"

"ٹرک والوں کو پرواہ ہی نہیں، اتنی روئی اُڑا دیتے ہیں"۔ اس نے

گالوں پر ہاتھ رکھ کر سوچا۔ پھر ایک دن روئی کی گانٹھوں سے لدا ایک ٹرک گودام سے سڑک پر آنے لگا تو اس نے لپک کر ڈرائیور کے کان میں چلّا کر یہی بات کہی، پٹھان ڈرائیور قہقہہ مار کر ہنس دیا اور جھٹکے سے گاڑی تیز کر کے سڑک پر سے گذر گیا۔

"مجھے کیا جب انہیں پرواہ نہیں" ——— وہ دُور سمندر کے پانی میں سورج کی شعاعیں چمکتی دیکھ کر سوچتا۔

"اگر میرے پاس ایک پہیّہ ہوتا ———" اُسے گاڑیوں کے پہیے بہت اچھے لگتے تھے۔ پہلے وہ گاڑیاں گنتا تھا اب پہیوں پر نظریں جما کر ان کی رفتار کا اندازہ کرنے لگا۔ جو پہیے اُسے بہت تیزی سے گھومتے معلوم ہوتے انہیں دیکھ کر وہ بے قابو ہو جاتا اور اپنے چھوٹے چھوٹے پیروں پر یوں کُودنے لگتا جیسے ریسوں کے دوران لوگ اپنے پسندیدہ گھوڑوں کو دوڑتا دیکھ کر دیوانوں کی طرح اچھلنے لگتے ہیں۔

"ایک پہیے کی گاڑی بھی تو بن سکتی ہے"۔ اُس نے سڑک کے بوڑھے جمعدار سے سوال کیا جس سے وہ خاصا مانوس ہو گیا تھا۔

"پہیے کے اوپر تختہ جڑ دو اور تھامنے کے لئے ہتّہ لگا لو۔ اچھا بھلا ٹھیلہ بن جائے گا"۔ جمعدار نے جھاڑو کے ہاتھ اِدھر اُدھر مارتے ہوئے کہا۔

"اچھّا پھر مَیں اس میں اپنے بہن بھائیوں کو بٹھا کر سَیر بھی کرا سکتا ہوں"

وہ خوشی سے پُوچھتا۔

"اب بہن بھائیوں کی بات چھوڑ۔ ایسے ٹھیلے سے تو اچھی بھلی کمائی ہو جاتی ہے۔ مزدوری مِل سکتی ہے —" بوڑھا اُسے کاروباری زندگی کے داؤ پیچ بتانے لگتا۔

"اچھا" — حمید کچھ اُداس ہو کر کہتا — اُس نے تو سمندر میں ایک آدمی کو ٹائر کے سہارے تیرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ تب سے یہ منصوبہ بھی اُس کے ذہن میں تھا کہ کسی طرح ایک بڑا سا ٹائر مِل جائے تو اُس میں بیٹھ کر مچھلیاں پکڑوں اور سمندر کی سیر کروں۔

ایک ٹرک میں بہت سی گیہوں کی بوریاں لدی تھیں۔ یکایک ایک بوری کا مُنہ کُھل گیا اور سُنہرے دانے سڑک پر چھینٹوں کی طرح اُڑ اُڑ کر پھیلنے لگے۔ کچھ دانے حمید کے پیروں میں آ پھنسے وہ انہیں مسلنے لگا۔ پھر ایک دم سے چونک گیا۔

"اتنا گیہوں گر گیا اب کیا ہو گا؟" اُس کے ننّھے سے دماغ نے پریشان ہو کر سوچا، گھر میں جب بھی کوئی چھوٹا سا نقصان ہوتا اُس کی ماں ہمیشہ سر پر ہاتھ مار کر فکرمند لہجے میں کہتی۔

"اتنا نقصان ہو گیا اب کیا ہو گا؟"

"بیٹا میرا ہاتھ بٹا دے" — بوڑھا جمعدار لمبی سی جھاڑو ہاتھ

میں تھامے گیہوں سمیٹ کر اپنی ٹوکری میں بھرنے کی کوشش کر رہا تھا حمید بھاگ بھاگ کر اس کا ساتھ دینے لگا۔ مگر جیسے ہی وہ تھوڑی سی گیہوں ایک جگہ اکٹھا کرتے کوئی ٹرک یا موٹر تیزی سے اس ڈھیری کو بکھیرتی ہوئی گذر جاتی۔ آدھ گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد کہیں سیر بھر گیہوں اکٹھا ہو سکا۔

"چاچا کتنی دیر سمیٹے گا یہ دانے ——" اُس نے سڑک پر بکھرے ہوئے دانے دیکھ کر کہا۔

"پندرہ سیر تو ہو گا یہ گیہوں ——" بوڑھا گذرتے ہوئے وقت سے بے نیاز آہستہ آہستہ سب کچھ بٹورنے کی کوشش کر رہا تھا —— "چلو چار دن کا آٹا بھی نکل آئے تو کیا بُرا ہے ؟"

حمید ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا اور سڑک سے گذرتی ہوئی ایک وکٹوریہ کے پچھلے تختے پر جھولنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ مُفت کی سواری کے مزے لیتا رہا مگر کوچوان کو پتہ چل گیا اُس نے اپنا چابک ہوا میں لہرایا۔ حمید کود کر اُتر گیا اور سڑک پر کنارے کنارے چلنے لگا۔

بہت سی نئی نئی عمارتیں بن رہی تھیں۔ وہ گردن اُٹھا کر ان کی اُونچائی کا اندازہ کرتا تو آنکھوں میں سورج کی چکا چوند بھر جاتی۔ وہ آنکھیں بھینچ کر مُنہ ہاتھوں میں چھپا لیتا۔ ایک عمارت بہت خوبصورت اور اُونچی تھی۔

اُس کے چاروں طرف چمکیلی، سُبک، بڑی بڑی موٹریں کھڑی رہتیں۔ اِن نئی نویلی گاڑیوں کے ہجوم میں چند پُرانی اور مٹیالی گاڑیاں بھی مُنہ چھُپائے کھڑی تھیں۔ حمید کو ان پُرانی گاڑیوں کے مالکوں پر رحم آنے لگتا۔

"بے چاروں کے پاس نئی گاڑیاں نہیں ہیں" وہ کسی نئی موٹر کی چکنی سطح سے پیٹھ رگڑتے ہوئے سوچتا۔

"اگر پُرانی گاڑی ہی کا پہیہ مل جائے تو کتنا مزا آئے"

"ان دفتروں میں جانے کے لئے کتنی بڑی بڑی گاڑیوں میں آنا پڑتا ہے" اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان عمارتوں میں کیا کام ہوتا ہے۔ جو لوگ ان حسین موٹروں میں بیٹھ کر آتے ہیں وہ کام کیا کرتے ہوں گے؟

پھر اس نے ذرا دُور بس اسٹاپ پر کھڑی ایک بس میں سے اتر کر بہت سے لوگوں کو آفسوں کے اندر جاتے دیکھا تو فیصلہ کیا کہ ایسی جگہوں پر پہنچنے کے لئے سب ہی کا موٹروں میں آنا ضروری نہیں ہوتا۔

وہ ایک گول پتھر کو پاؤں کے انگوٹھے سے اُچھالتا آگے بڑھنے لگا۔ پٹرول پمپ کے قریب پہنچ کر وہ رُک گیا۔ ایک طرف بڑے بڑے ٹائیروں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہ انہیں للچائی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر قریب جا کر انہیں آہستہ سے چھُوا اور گھبرا کر ہٹ گیا۔ سب لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے کسی نے اس کی طرف نہیں دیکھا —— اُس کے جی

میں آئی ایک ٹائر اُٹھا کر چل دے مگر ہاتھ لگانے پر پتہ چلا کہ ٹائر بہت بھاری ہے۔ دھکا دے کر ہی آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اُس کے قریب سے ایک سائیکل سوار گھنٹی بجاتا کوئی فلمی دُھن گنگناتا ہوا نکل گیا۔

"سائیکل کا پہیہ تو ہلکا ہوتا ہے"۔ اُس نے حسرت سے سائیکل سوار کی لہراتی قمیص کو دیکھ کر سوچا اور آگے بڑھ گیا۔

اگلے دن وکٹوریہ گزری تو وہ پھر اُس کے پیچھے بیٹھ کر سواری کرتا رہا۔ کبھی دوسری سمت سے آنے والی بگی میں دوڑ کر بیٹھ جاتا، مگر گھوڑے کی ٹخ ٹخ سے وہ جلد ہی بیزار ہو گیا۔ ایک دن وہ یوں ہی بس کے اندر بیٹھ کر ایک کونے میں دبک گیا اور اگلے اسٹاپ پر اُتر کر گھر تک پیدل آیا۔ کسی نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ بس کنڈکٹر اگلی سیٹ کے مسافروں کے ساتھ اُلجھا ہوا تھا۔ پھر وہ اکثر ڈرائیور اور کنڈکٹر کی نظریں بچا کر بس میں بیٹھنے لگا۔ بس کی سواری میں اس کو بڑا مزا آتا۔ ایک عدد پہیہ حاصل کرنے کی خواہش کو بھی ذرا سی تسکین ملنے لگی۔ اب وہ بس میں بیٹھ کر شہر تک جانے لگا اور وہاں سے واپس گھر بھی بس میں ہی بیٹھ کر آیا کرتا۔ کبھی کبھار کنڈکٹر کی گرفت میں آتا تو وہ حمید کی بھولی بھالی صورت دیکھ کر اُسے چھوڑ دیتا۔ پھر حمید شہر کی سڑکوں پر اُتر کر گھومنے لگا۔ یوں ہی دوکانوں میں جھانکا کرتا۔ کبھی گھنٹوں ایک کونے میں کھڑا ہجوم اور ہنگاموں کو تکا کرتا۔ اُس کے ننھے

سے آٹھ برس کے ذہن میں کوئی بھی چیز ٹھیک طرح سے نہ سماتی۔ یوں لگتا جیسے دماغ میں بھی ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے۔ بہت سی موٹروں، ٹرکوں، بسوں اور پہیوں کا ہجوم!

ایک دن اس نے دیکھا ایک گھوڑے گاڑی میں بہت سے بچے بیٹھے اسکول جا رہے ہیں۔ اچانک گھوڑے کا پاؤں پھسل گیا۔ سامنے سے ایک تیز رفتار بس آ رہی تھی۔ حمید نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک آنکھ پر سے ہاتھ ہٹا کر جھانکا تو اس کی جان میں جان آئی۔ بس موڑ کاٹ کر نکل گئی تھی۔ گھوڑا اُٹھ کر کھڑا ہو رہا تھا اور کوچوان بچّوں کو مضبوطی سے بیٹھنے کی ہدایت کر رہا تھا —— حمید کو ایک چھوٹی سی بچّی پر بہت رحم آیا جو اگلی سیٹ پر سب سے اونچی جگہ بیٹھی تھی۔ اس نے سوچا ذرا بھی دھکا لگے گا تو یہ بچّی ضرور گر جائے گی —— اپنے خوف پر قابو پانے کے لئے وہ کچھ دور تک گاڑی کے ساتھ دوڑتا رہا مگر آگے فٹ پاتھ ٹوٹا ہوا تھا۔ بہت سے مزدور گرد و غبار کے دھوئیں میں پتھر پھینک رہے تھے۔ حمید رُک گیا اور چیختے چلّاتے ہارن کی آواز سنتا رہا: "بچ کے بچ کے ——" تھوڑی دیر بعد کوچوان کی آواز شور میں دب گئی۔

ایک صبح وہ شہر میں آیا تو اُسے ماحول کچھ مختلف لگا۔ دوکانیں بند ہو رہی تھیں۔ لوگ اِدھر اُدھر تیزی سے بھاگ رہے تھے۔ سواریاں بھی بہت

کم تھیں اور چاروں طرف پولیس کے ٹرک گشت کر رہے تھے۔ حمید ایک ٹرک کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس میں کچھ سپاہی بیٹھے تھے۔ ٹرک کے پہیے بہت مضبوط اور موٹے تھے۔ ان پہیوں کے نیچے کوئی آجائے تو بس۔ اس کی نظروں میں وکٹوریہ والے نیچے گھوم گئے، وہ خوف سے لرز اٹھا۔ اس بھاگ دوڑ میں وہ ایک بہت بڑے انسانی ریلے میں بہنے لگا۔ قریب ہی کچھ پھٹا۔ زور کا دھماکہ ہوا۔ پھر ساری فضا دھواں دھواں ہو گئی۔ بہت سے لوگ ایک احاطے میں گھس گئے۔ جس میں کچھ دکانیں ایک ورکشاپ اور چند شیڈ بنے تھے۔ لوگ دکانیں لوٹ رہے تھے یا یوں ہی شور مچا رہے تھے۔ اُن کے آگے پیچھے پولیس کی وردیاں چاروں طرف نظر آرہی تھیں۔ اچانک حمید کی نظریں شیڈ کے کونے میں رکھے ہوئے بڑے سے گول گول ایک سیاہ پہیئے پر جم گئیں۔ وہ سب کچھ بھول کر تیزی سے اُدھر بھاگا اور ٹائر کی اُبھری ہوئی کھردری لکیروں میں اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیاں گاڑ دیں ——— ٹائر بہت بھاری تھا۔ کسی جیپ یا ویگن کا لگتا تھا۔ حمید نے اُسے آہستہ آہستہ دھکا دینا شروع کیا۔ اور بڑی مشکل سے بچتا بچاتا احاطے کے پھاٹک تک جا پہنچا مگر سامنے ہی پولیس کا ایک ٹرک کھڑا تھا۔ وہ دیوار کے سہارے آگے بڑھنے لگا۔

"کہاں جاتا ہے؟" ——— ایک کرخت آواز نے اُس کا پیچھا کیا۔

وہ کانپ کر پھاٹک کے کھمبے سے چپک گیا۔ اُسی لمحہ پہیہ سڑک کی جانب

لڑھکنے لگا۔ حمید کی جان نکل گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح اُس کے پیچھے لپکا مگر اُس کے پیر من من بھر کے ہو گئے۔ ایک سپاہی نے ٹامر کو اُٹھا کر ٹرک کے اندر پھینکا اور پھر بھاگتے ہوئے حمید کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ کر آدمیوں سے ٹھنسا ٹھنس بھری وین میں دھکیل دیا۔

چڑھاوے کی چادر

بہت دیر سے وہ کرسی پر بیٹھی پاؤں ہلا رہی تھی۔ شلوار کے پائنچے جوتوں میں الجھنے لگتے تو وہ انہیں جھک کر علیحدہ کر دیتی اور رُک کر پھر پاؤں ہلانے لگتی۔

"رابعہ باہر سے پودینہ توڑ کر لا دے" ـــــــ اُس کی ساس باورچی خانے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کمرے میں آ گئی۔ اور اُس کی جانب پلاسٹک کا چھوٹا سا پیالہ بڑھا دیا۔ رابعہ نے جھپٹ کر پیالہ ساس کے ہاتھ سے لیا اور کیاری کے قریب بیٹھ کر پودینہ توڑنے لگی۔

"ایک ہی دن میں کیاری خالی کر دے گی" ـــــــ پیالہ کب کا پودینے سے بھر گیا تھا اور پتیاں نیچے گر رہی تھیں۔ ساس پیالہ لے کر اندر چلی گئی۔ رابعہ وہیں اکڑوں بیٹھی انگلیوں میں بسی میٹھی میٹھی خوشبو کو سونگھتی رہی۔ اُس

کے دماغ پر عجیب سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں ہے؟ بس بیٹھی ہے تو بیٹھی ہے اور کھڑی ہے تو کھڑی ہے۔

پودینہ تھا ——— نہیں مہندی تھی ——— ہاں شاید مہندی کی پتیاں ہی تھیں۔ ایک بڑے سے کٹورے میں بھر کر ماں نے اُسے دیا تھا۔

"سِل بٹّے کو اچھی طرح صاف کر کے پیسنا۔"

پیستے ہی پیستے اُس کے دونوں ہاتھ لال ہو گئے تھے۔ پھر ماں نے اُس کے ہاتھوں پر ڈھیر ساری گیلی مہندی تھوپ کر اُسے لیٹنے کو کہا تھا اور خود گھر کے کاموں میں لگ گئی تھی۔

رابعہ لیٹے لیٹے سو گئی۔ جانے کون سا خواب دیکھا تھا اُس نے جو وہ آپ ہی آپ اُٹھ کر مسکرانے لگی تھی۔

"مگر اُس سے پہلے کیا ہوا تھا؟" رابعہ نے سر جھٹک کر اپنے ذہن پر بہت زور دیا۔ پر یُوں لگتا تھا کہ چیونٹیوں نے لکڑی کھود کھود کر بہت سا گندہ بُرادہ اس کی کھوپڑی میں بھر دیا ہے۔ کہیں سے کوئی یاد اندر داخل نہ ہو پاتی۔

وہ بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ اسکول گئی تو تھی مگر کیا پڑھا تھا کچھ یاد نہیں ——— اور پڑھا بھی تھا یا بس کچّی پکّی بیریاں ہی توڑتی تھی۔ پندرہ، سولہ برس کی ہی تو تھی جب اکرم کا رشتہ اُس کے

لئے آیا تھا۔ عمر میں وہ رابعہ سے خاصہ بڑا تھا مگر سب کو حیرت ہوئی اتنے اچھے رشتے پر۔ وہ افسر تھا اور اکلوتا بھی کھاتا پیتا گھر اور شریف لوگ۔ اور رابعہ ـــــ بہن بھائیوں کے ریلے میں کبھی ماں باپ کو یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ کس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور کون بھوکا سو گیا۔ رابعہ کی ساس نے جہیز کا بکھیڑا یہ کہہ کر دور کر دیا کہ ـــــ

"میرا ایک ہی بیٹا ہے گھر بھرا ہے آپ لوگ کچھ دیں گے بھی تو وہ اسٹور ہی میں پڑا رہے گا" ـــــ

ضرورت مند شائد طعنہ کو بھی کھٹی میٹھی گولیاں سمجھ کر آہستہ آہستہ چوستے رہتے ہیں۔ رابعہ کے ماں باپ کئی دن تک رابعہ کے سسرال والوں کی فراخ دلی کی تعریف کرتے رہے۔

سوکھی مہندی ہاتھ سے چھڑاتے ہوئے اس کی ماں نے اُسے خوب مل مل کر نہانے کی تاکید کی اور بھاگ کر باہر بیٹھے ہوئے مہمانوں کی خاطر تواضع میں لگ گئی۔ رابعہ کو سرخ جوڑے پر بہت سے پھول اور زیور پہنائے گئے۔ کس نے پہنائے تھے اتنے بہت سے پھول اور زیور ـــــ اُسے کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ موٹر میں بیٹھنے لگی تھی تو کچھ ہنگامہ بھی ہوا تھا۔ وہ شائد روئی بھی تھی مگر کم کم۔ اور روتی بھی کیوں؟ کوئی سکھ دیکھا ہوتا تو اسے چھوڑتے ہوئے دل بھر آتا۔ گاڑی میں بیٹھ کر پہلی

مرتبہ اُس نے اپنے دولہا کو دیکھا۔ زرد چہرہ اور آنکھوں کے نیچے حلقے ـــــ پھر اُس نے زیادہ تفصیلی جائزہ نہیں لیا۔ اور سر جھکا کر اپنے کپڑوں پر بنے سنہرے بیل بوٹے دیکھنے لگی۔ اس نے کبھی آج تک کسی چیز کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا تھا۔ اُسے فرصت ہی نہیں ملی کبھی کچھ جاننے کی۔ جو کچھ سامنے آتا گیا وہ کرتی رہی۔ عجیب اُڑا اُڑا سا تھا اس کی زندگی کا ہر ورق۔ پھر بھی اپنے شوہر کو دیکھ کر اُس کے دل میں رحم جاگ اُٹھا۔

"بے چارا ـــــ" وہ اندر ہی اندر کسی سے مخاطب تھی۔ مگر پھر اسے دوپہر کو دیکھا ہوا خواب یاد آگیا۔ جب وہ مہندی لگا کر لیٹ گئی تھی۔ اور ـــــ اور جاگتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ ہاں! اُس رات موٹر میں تو وہ خواب یاد آگیا تھا۔ بہت اچھی طرح ـــــ مگر ـــــ اب کیا ہو گیا ـــــ کہاں کھو گیا ـــــ رابعہ نے پودینے کی کیاری کے کنارے لگی ہوئی اینٹ کو اس زور سے کھینچا کہ وہ اکھڑ کر اُس کے ہاتھ میں آگئی۔

دھوم دھام تو یہاں بھی نہیں تھی۔ مگر کھانا بہت مزیدار تھا۔ رابعہ نے پہلی مرتبہ زندگی میں اتنا اچھا کھانا پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ عورتیں حیرت سے دلہن کو اس بے حجابی سے کھانا کھاتے دیکھ رہی تھیں۔ مگر وہ تھی بھی تو چھوٹی سی۔ بالکل بچی لگ رہی تھی۔ لال جوڑے میں۔ سب نے نظر انداز کر دیا اور اسے کمرے میں پہنچا دیا۔

بھاری بھرکم پلنگ کے نرم اور ملائم گدے پر بیٹھنا اسے بہت اچھا لگا۔ وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو پاؤں سمیٹ کر لیٹ گئی۔ مگر جلد ہی اُسے نیند آنے لگی اور سکڑے ہوئے پاؤں آہستہ آہستہ کھل کر سیدھے ہو گئے۔ اس کی آنکھ کھلی تو وہ کچھ دیر تک دم سادھے چت لیٹی رہی۔ سجے سجائے کمرے میں، آرام دہ بستر پر ـــــ اُسے وہم سا ہوا۔ ابھی تک اس کے ہاتھوں سے مہندی کی خوشبو آرہی تھی۔ کل تک تو چھوٹے بھائی بہنوں کی فوج اس کے چاروں طرف سمٹی سکڑی پڑی رہتی تھی۔ جن کے کپڑوں اور جسموں سے اٹھتی ہوئی بُو کی وہ عادی ہوگئی تھی۔

وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔ پلنگ کے دوسری جانب آرام کرسی پر اس کا شوہر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ سہم کر اُس نے اپنے آپ کو پھر سمیٹ لیا۔ یوں جیسے اسکول میں دیر سے پہنچنے پر استانی کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہو جاتی تھی۔

"نیند آگئی تھی کیا" ـــــ اس کے شوہر نے محبت سے پوچھا مگر لہجے میں جانے کیسا حکم تھا۔ وہ اٹھ کر اُس کے پاس آگیا اور اُسے بھرپور نظروں سے دیکھنے لگا۔

رابعہ نے سٹ پٹا کر دونوں ہاتھ اپنے شانوں پر رکھ کر خود کو چھپانے کی کوشش کی۔

"یہ کپڑے اُتار دو۔"

وہ ہکّا بکّا اپنے شوہر کا منہ تکنے لگی۔

"تمہیں کچھ بھی نہیں معلوم" —— اکرم نے سوال کیا۔

رابعہ نے گردن انکار میں ہلا دی۔

"کسی نے کچھ نہیں بتایا؟"

پتلی سی گردن دوبارہ انکار میں ہلی۔

"اچھا" —— اکرم نے کچھ اطمینان اور بے یقینی سے گہرا سانس لیا۔

"ہمارے درمیان جو کچھ بھی ہو کسی سے کبھی اُس کا ذکر نہ کرنا سمجھیں —— ایسی باتیں کرنا گناہ ہے —— تمہاری کوئی سہیلی ہے؟"

وہ سوچنے لگی۔ سہیلیاں تھیں تو مگر پتہ نہیں وہ سہیلیاں ہی تھیں یا نہیں۔

اُس نے ایک مرتبہ پھر انکار میں گردن ہلا دی۔

اکرم اطمینان سے پاؤں اٹھا کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

رابعہ کو تھوڑا سا سکون تھا کہ وہ آج خوب مل مل کر نہائی تھی اور بہت صاف ستھری تھی۔

کئی ہفتے بیت گئے۔ رابعہ کو عجیب سے ڈھیلے پن کا احساس

ہوتا۔ میکے سے ایک مرتبہ کوئی رسماً بلانے آیا مگر شوہر نے جانے کی اجازت نہیں دی تب سے اس کا رشتہ باہر کی دنیا سے ٹوٹ گیا تھا۔

ہر رات بتّی گُل کر کے اکرم اُس کے جسم کے کسی نہ کسی حصّے سے کھیلا کرتا اور وہ اندھیرے میں ساکت لیٹی، مٹھیاں کَس کر باندھے تنی رہتی۔ لیٹے لیٹے اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے بہت سی چھپکلیاں اس کے جسم پر آہستہ آہستہ رینگ رہی ہیں۔ وہ گھبرا کر ان چھپکلیوں کو جھٹکنا چاہتی تو وہ چاروں طرف سے اُسے گھیر لیتیں۔ پھر یہ رینگتی ہوئی چھپکلیاں اکرم کی انگلیاں بن جاتیں۔ جو اُس کے دماغ کے گودے میں دھنسنے لگتیں۔ وہ انہیں دھکیل کر باہر نکالنے کی کوشش کرتی اور اُس خواب کو دہرانے لگتی جو اُس نے شادی سے پہلے دوپہر کو دیکھا تھا مگر وہ خواب اب دھندلا گیا تھا۔

کیسی بے کلی تھی جو ہر دھڑکن میں سماتی جا رہی تھی۔ پانی پیتی تو پیتی ہی جاتی۔ گلاس کو اتنے زور سے ہاتھوں میں بھینچتی کہ گلاس چُورا چُورا ہو جاتا اور ہاتھ میں شیشے کی باریک کرچیاں چبھنے لگتیں۔ تکلیف کی شدّت سے اُس کے آنسو نکل آتے مگر وہ اُسی طرح بے سدھ بیٹھی رہتی۔ کیسی بے چینی تھی کہ جی چاہتا یہ چبھن اُس کی رگ رگ میں اُتر جائے، جسم میں ہر جگہ کھُب جاتے۔ خون کی باریک باریک دھاریں اُس کی ہتھیلیوں کی لکیروں میں دوڑنے لگتیں۔ یہ کیسی پیاس تھی کہ ہر لمحہ بڑھتی ہی رہتی سلگتی

ہی رہتی۔ رابعہ کا بس چلتا تو کسی کنوئیں کی اندھیری گہرائی میں اتر جاتی اور زمین کا سارا پانی اپنے اندر جذب کر لیتی —— مگر بستر پہ رینگنے والی چھپکلیاں ایک دم سے بہت بڑے مگرمچھ کا روپ دھار لیتیں جو اُس کی طرف منہ پھاڑے بڑھنے لگتا اور لیٹے لیٹے رابعہ کی گھگھی بندھ جاتی۔

نئے سال کے کیلنڈر میں بچّوں کی بہت سی تصویریں تھیں۔ وہ اُلٹ پلٹ کر دیکھتی رہی پھر نہ جانے جی میں کیا آیا کہ سب تصویریں کاٹ ڈالیں اور انہیں مسہری کی ٹیک پر چپکانے لگی۔ سارا دن وہ اِسی کام میں لگی رہی۔ ساس نے کچھ کہا تو اُسے ایسے گھورا کہ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ شام ہوتے ہوتے اسے نیند آ گئی اور وہ تکیہ ٹانگوں کے نیچے دبا کر سو گئی۔

"چلو ڈاکٹر کے پاس"۔ اکرم نے جھنجھلاہٹ میں چپکی ہوئی تصویریں کو ایک ایک کر کے اُتارتے ہوئے کہا۔ اُس کا جی چاہا اکرم کا ہاتھ جھٹک کر اِن تصویروں سے ہٹا دے۔

"کمینہ ——" وہ اُسے موٹی سی گالی دے کر دل کی بھڑاس نکالنا چاہتی تھی مگر چپ چاپ اُن انگلیوں کو دیکھتی رہی جو رات کے اندھیرے میں چھپکلیاں بن جاتی تھیں۔

"مگر یہ ڈاکٹر بھی سالے ایک سے ایک بدمعاش ہیں۔ اکیلے میں

ہی معائنہ کرنا چاہتے ہیں" ــــــ وہ پلنگ پر بیٹھ کر جُوتے اُتارنے لگا۔ رابعہ نے کراہت سے دانت بھینچ کر کھڑکی کے باہر تھوک دیا اور پلنگ کی ٹیک پر گوند کے نشان دیکھنے لگی جہاں سے اکرم نے تصویریں اکھاڑی تھیں۔

بات تو وہ پہلے بھی بہت کم کرتی تھی۔ ماں باپ کے گھر میں چیخ پکار اور غل غپاڑہ بہت تھا مگر بات چیت کوئی نہیں کرتا تھا سب ایک دوسرے پر چلّاتے تھے یا کچھ مانگتے تھے یا کوئی کام کرواتے تھے۔ کام تو یہاں بھی بہت سے تھے۔ گھر کافی بڑا تھا مگر وہ سارا دن ایک کرسی پر بیٹھی رہتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کام کرے اور کس کے لئے کرے۔ اُنگلیوں کے لئے ؟ ــــــ مگر وہ تو اس کی دشمن تھیں۔ اُس کے شوہر کا چہرہ ایک موٹا سا انگوٹھا بن جاتا اور رابعہ کے جی میں آتا کہ اس موٹے سے انگوٹھے کو اینٹیں مار مار کر قیمہ بنا دے۔

کوئی مہمان آتا تو ساس رابعہ کی کمزوری اور بیماری کا قصّہ اتنی تفصیل سے بتاتی کہ اُس کی نس نس میں ایک بیمار زدہ ٹھنڈک اتر جاتی۔ کیا بیماری تھی اُسے ؟ کچھ تو تھی کہ وہ یوں گُم سم، کمزور اور دبلی ہوتی جا رہی تھی۔ بہت دنوں بعد جب اُس نے بولنے کی کوشش کی تو اُس کے حلق سے کچھ دیر تک ٹھنڈی ٹھنڈی ہَوا نکلتی رہی اور جب اکرم نے

اسے اپنے قریب لیٹنے کا حکم دیا تو وہ دیوانوں کی طرح حلق پھاڑ کر چلّانے لگی۔

"کیا ہوا"؟

"اِسے کیا ہو گیا ہے"۔۔۔ دونوں ماں بیٹے اُسے تھام کر کھڑے ہو گئے۔

"دھوکا ہوا ہے ہم سے"۔ ساس نے نفرت اور غصّے سے کہا۔

"ہم اِسے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں"۔۔۔ اکرم نے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

"اب ڈاکٹر واکٹر بے کار ہیں۔ دیکھتے نہیں اس کی حالت۔ اتنا روپیہ برباد ہو گیا مگر کیا ہُوا"۔ اکرم نے ماں کی بات مان لی اور رابعہ کو بستر پہ لٹا دیا۔

وہ تیز بخار میں کئی دن تک جھلستی رہی۔ ذرا ہوش آتا تو اپنے آپ کو چاروں طرف سے مہکتے ہوئے دھوئیں میں گھرا پاتی۔ کوئی آئت اس کے کانوں میں پڑتی، کبھی کوئی زور زور سے اُس پہ پھونکیں مارتا۔ ہانپتا، کانپتا بخار آہستہ آہستہ اُس کا ساتھ چھوڑنے لگا۔ لاشعوری طور پہ یہ بیماری اُس کے جسم کا آخری احتجاج تھی۔ اُس نے چپ چاپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے حوالے کر دیا۔

دفتر کی میز پر اکرم چڑا ہوا بیٹھا تھا۔ کسی انتقامی جذبے کے تحت اُس نے فون اٹھایا اور اپنے اسسٹنٹ کو پھٹکارنے لگا۔ مگر اُسی لمحہ کچھ لوگ ملنے آگئے۔ اُس نے جلدی سے فون بند کر دیا اور ہنس ہنس کر اُن لوگوں سے باتیں کرنے لگا۔

"یہ کام تو شائد نہ ہو سکے"۔ بظاہر شائستگی سے اُس نے انکار کیا اور چپراسی سے چائے لانے کو کہا۔

"پھر کیا فائدہ یہاں بیٹھنے کا" ــــــ دبلے پتلے آدمی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں آپ تشریف رکھئے شائد بات بن جائے" ــــــ وہ لوگ غرض مند تھے۔ پھر بیٹھ گئے۔ اکرم نرمی اور ہمدردی سے بات کرنے لگا اُسے اندیشہ تھا کہ یہ لوگ چلے نہ جائیں۔ اُسے بہت خوشی ہوتی جب لوگ اپنی اپنی غرض لے کر اس کے پاس آتے۔ وہ اپنے آپ کو بہت مصروف اور کارآمد محسوس کرتا مگر اُن کا کام پورا ہوتے دیکھ کر اُسے اپنی کم مائیگی اور بے اوقاتی کا احساس ہونے لگتا وہ فوراً کوئی نہ کوئی روڑا اٹکا دیتا۔ کسی ماتحت کی صورت دیکھ لیتا یا بیٹھے بیٹھے اس کا خیال آجاتا تو اکرم بے چین ہو جاتا۔ رات رات بھر اُنہیں کام میں لگائے رکھتا خود بھی اُن کے سر پر سوار رہتا۔ وہ ذرا موج میں آتے اور یہ کھول اٹھتا۔ گالیوں پر اتر

آتا۔ وہ بے چارے اپنی نوکریوں کے خول میں گھس کر خیر منانے لگتے۔

چائے آئی تو اُسے آنے والوں کی تواضع کرتے ہوئے کوفت ہونے لگی۔ خود بخود چڑ کر، کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ وہ لوگ خوشامدانہ انداز سے چائے پی کر اپنے آپ پر ڈھیروں احسان لادے کچھ کھسیائے ہوئے سے باہر نکل گئے۔ اکرم بریف کیس کھول کر اس میں رکھی ہوئی اپنی بیوی کی انگیا سونگھنے لگا جو صبح ہی اس کے جسم سے اتاری تھی۔ پیر صاحب بھی خوب تھے۔ وہ بریف کیس بند کر کے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ دو تین گھنٹے تو پیر صاحب کی زیارت میں لگیں گے۔

'کمال کے بزرگ ہیں۔ عورت کی انگیا سونگھ کر اُس کی بیماری اور بیماری کا علاج سب کچھ بتا دیتے ہیں''۔ ایک رشتے دار نے اُسے مژدہ سنایا تھا۔ وہ مسلسل پیر کے آستانے پر حاضری دینے لگا۔ حاجت مندوں کی بھیڑ رہتی تھی کئی دن تک وہ چکّر لگاتا رہا۔ پیر نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ تب وہ نیاز کے ٹوکرے اپنے ہاتھ سے ان کے سامنے رکھنے لگا اور اُنہوں نے اپنی چندھیائی آنکھیں اٹھا کر اُس کا بھرپور جائزہ لیا۔ ننگے پاؤں۔ سر پر ٹوپی رکھے وہ ہاتھ باندھ کر عاجزی سے کھڑا ہو گیا۔

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا اور سرگوشی میں بولے۔

''اپنا دکھ کہہ ڈالو''

وہ بیوی کی حالت بیان کرتے کرتے رو دیا۔

"کل اس کا سینہ بند جسم سے اتار کر لاؤ"۔۔۔۔ وہ خوش خوش گھر لوٹ آیا اور صبح ایک لفظ کہے بغیر رابعہ کی انگیا اپنے ہاتھ سے اتار لی۔ رابعہ نے اُسے گھور کر دیکھا وہ سٹ پٹا گیا۔ آجکل وہ اس سے ڈرنے لگا تھا اور آنکھ ملاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ حالانکہ وہ چپ چاپ ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی یا لیٹی رہتی کسی سے ایک لفظ بھی نہ بولتی۔

"ہچہ ۔۔۔۔۔" پیر نے بس ایک مرتبہ انگیا کے چھوٹے چھوٹے تکونوں کو دیکھا۔ بالشت سے لمبائی ناپی اور اکرم کو ایک شیشی تھما دی۔

"مشکل ہے بہت مشکل ۔۔۔۔ مگر۔" عصا تین مرتبہ زمین پر مارا اور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"اُس کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ اس تیل کی مالش کرو دونوں چھاتیوں پہ ۔۔۔۔ اور تین مہینے بعد آکر بتاؤ۔"

اکرم نے پیر کے موٹے وزنی ہاتھ سے شیشی لے لی اور عقیدت سے اُن کے پاؤں تھام لئے۔

"تیل کی مالش بھی کرتے ہیں مگر ٹھٹھہ والے بزرگ کی درگاہ میں جانا بہت ضروری ہے۔ عرس کے دن قریب آرہے ہیں۔ تم دفتر سے چھٹی لے لو، تو ہم وہاں چل کر رہتے ہیں۔ کیا پتہ انہیں کی برکت سے تمہارا

گھر آباد ہو جائے"—— ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

اکرم چھٹی تو لے سکتا تھا مگر اُسے وحشت ہونے لگی۔ دو تین کام ادھورے پڑے تھے۔

"میں نے چھٹی لے لی تو وہ کام پورے ہو جائیں گے"—— وہ مسرور اور بشاش چہرے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ لوگوں کے چہروں پر چمکتی ہوئی آسودگی اور مسکراہٹ دیکھ کر اُس کے اندر کوئی چیز سلگنے لگتی اُس کا جی چاہتا تمام شگفتہ چہروں پر سے ریتی کھودنے والے پھاوڑے کے ذریعے مسکراہٹیں اور قہقہے کھرچ کر اُن پر اپنے اندر کی راکھ مل دے۔ کیسی ٹھنڈی اور لجلجی راکھ بھری تھی اس کی کرم خوردہ ہڈیوں میں۔

"میری غیر موجودگی میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں——" اُس نے کئی لوگوں کی خوشیاں نوچ کر دفن کر دیں۔

"پھر؟" ماں نے پوچھا۔

"آپ رابعہ کو لے کر درگاہ میں رہیں میں عرس سے ایک دن پہلے آجاؤں گا"

ایک طرف بنے ہوئے لمبے سے سائبان کے نیچے بیسیوں خاندان اپنے اپنے بوریئے بستر سمیت پڑے تھے۔

کوئی پاگل تھا، کسی کو دَورے پڑتے تھے، کوئی مفلوج تھا، کوئی

بے اولاد اور کچھ خاندان منتّیں پوری کرتے رہے تھے۔ سارا دن پھٹی ہوئی جلد والے گندے بچّے اِدھر اُدھر بھاگتے رہتے۔ کبھی کسی کا پاگل پن بڑھ جاتا تو اسے باندھنا پڑتا۔ کسی عورت پر دَورہ پڑتا تو وہ مزار کے باہر لٹکتی ہوئی لمبی سی رسّی کو پکڑ کر جھولنے لگتی اور اول فول بکا کرتی۔

کیسے لگتے تھے یہ لوگ؟ ——— رابعہ نے راستے میں کوڑے کے ایک ڈھیر پر بھنبھناتی مکھیوں کو دیکھا تھا۔ اُسے بیٹھے بیٹھے اُلٹی ہوگئی۔

"کیا ہوا ہے اِسے؟" ان کے قریب بیٹھے ہوئے ایک خاندان کی ادھیڑ عمر عورت نے جو اسٹوو پر سبزی پکا رہی تھی رابعہ کی ساس سے پوچھا۔ پھر دونوں دیر تک باتیں کرتی رہیں۔

"یہاں سے فائدہ ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ تمہیں ایسی جگہ کا پتہ بتاؤں گی کہ بس ایک سال میں دیکھنا کیا ہو جائے گا۔"

"اچھا۔"

"وہ پاؤں میں بھاری زنجیریں پہناتے ہیں۔ خدا جانے کیا تاثیر ہے اُن زنجیروں کی بس دنوں میں تمہاری بہو کا پیر بھاری ہو جائے گا۔"

"آپ گئی ہیں کبھی؟"

"میری نند کی چھوٹی بہو پر جن آ گئے تھے۔ وہاں لے گئیں۔ دو سال ہو گئے دو پوتے کھلا رہی ہیں اور بہو کی صحت ایسی ہو گئی ہے جیسے انار

کے رس میں میں نہا کر آئی ہو۔"

بوڑھی عورت اپنے خاندان والوں کو کھانا کھلانے لگی زمین پر کچھ نہ کچھ بہہ رہا تھا۔ پھیلتی ہوئی دھوپ کے ساتھ گندگی بھی بڑھ رہی تھی۔ رالعہ چٹائی پر اوندھی لیٹی کمزور نظروں سے سب کچھ دیکھتی رہی۔ پھر آنکھیں بند کر کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

اکرم نے کئی کلرکوں اور محکمے کے انچارج کو دفتر سے نکلوانے کی دھمکی دے دی تھی اور اب اُن کے سہمے ہوئے پریشان حال چہرے دیکھ کر اُسے کچھ سکون ملنے لگا تھا۔ جو لوگ اپنی غرض لے کر اُس کے پاس آتے انہیں وہ خوشی خوشی چائے پلاتا۔ کبھی کوئی چھوٹا موٹا کام بھی کر دیتا مگر اندر ہی اندر بے کیف اور بے مزہ ہوتا رہتا۔ عجیب حالت تھی اُس کی۔ ماحول کا کھچاؤ اور چڑچڑا پن اسے بہت مانوس لگتا۔ کیسی ہم آہنگی تھی اُس کے اندر اور باہر کی کیفیت میں۔ اُس کا بس چلتا تو سب کو تنے ہوئے باریک لوہے کے تاروں پر ساری عمر چلتے رہنے کا حکم دے دیتا اور اس تماشے کو زندہ رکھنے کے لیئے کبھی کبھی ان کے حلق میں شہد کے قطرے ٹپکا دیتا۔

دو دن کے بعد وہ عُرس سے واپس آیا تو آفس انچارج سے لے کر چپراسی تک سب کے لئے چھوٹی چھوٹی سوغات اور تبرّک لے آیا۔

ہفتوں سخت زمین پر چٹائی بچھا کر لیٹنے کے بعد رالعبہ اپنے بستر

پر سوئی تو اُسے نیند اچھی آئی۔ بھوک بھی تھوڑی تھوڑی لگنے لگی۔ ساس نے ایک ساتھ کئی منتیں مان لیں۔ اُسے لے کر مجلسوں اور میلاد کی محفلوں میں جانے لگی۔ رابعہ اپنے آپ کو ڈھیر ساری سجی بنی تندرست اور ہنستی بولتی عورتوں کے بیچ میں پاتی تو بیٹھے بیٹھے ہنس دیتی۔ ایک مرتبہ عین بیان کے دوران وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ عورتیں اُسے گھور گھور کر دیکھنے لگیں۔ پھر سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگیں اور ساتھ ساتھ اُسے ہمدردی اور تعجب سے دیکھتی بھی جاتیں۔

اب وہ رات کو سونے کے لئے لیٹتی تو اُسے ایک ہی خواب دکھائی دیتا۔ اُسے اپنا جسم کھلتا ہُوا محسوس ہوتا۔ یوں لگتا جیسے سوکھی سہمی چھاتیاں ایک دم سے بھر گئی ہیں اور دودھ کے وزن سے بوجھل ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک ننھا سا گول گتھنا بچّہ اس کی چھاتیوں پر اپنے چھوٹے چھوٹے گدرائے ہاتھ رکھے چٹخارے لے لے کر دودھ پی رہا ہے اور وہ بالکل پُرسکون لیٹی اپنے سینے پر بچّے کے ہاتھ اور منہ میں بھرے دودھ کو محسوس کرتی رہتی پھر آہستہ آہستہ اُس بچّے کے بڑے بڑے نوکیلے دانت نکل آتے جن سے وہ اس کی چھاتیاں چباتے لگتا یہاں تک کہ اُس کا سینہ لہولہان ہو جاتا وہ درد کی شدّت اور بے بسی سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتی تو وہ دانت زیادہ مضبوطی سے اس کے نرم نرم گوشت میں پیوست ہونے

لگتے وہ چیخ مار کر آنکھیں کھول دیتی اور دیر تک اندھیرے میں ساکت لیٹی رہتی۔ اُس کا شوہر ایک ہاتھ میں شیشی تھامے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اس کی سمٹی سکڑی گولائیوں پر مالش کرتے کرتے انہیں بے رحمی سے مسلنے لگتا۔ وہ بے بسی سے برسوں پہلے دیکھے ہوئے خواب کو یاد کرنے کی کوشش کرتی جو اُس دوپہر کو اُس نے دیکھا تھا۔ جانے کیا تھا اُس خواب میں کہ اب دُھند کی دبیز تہہ اور بھی تاریک ہو گئی تھی اور اِس دھند میں وہ بچّہ ! ہمکتا، کلکاریاں مارتا بچّہ اُس کی کمزور چھاتیوں سے منہ موڑ کر کہیں بہت دور خلا میں لٹکا ہوا تھا۔

اُس کا ذہن تو بالکل ماؤف ہو چکا تھا۔ جیسے کسی نے گھونسے مار مار کر اُسے پلپلا کر دیا ہو اور اب وہ ہوا نکلی گیند کی طرح چاروں طرف سے پچکا پڑا تھا اُس کی کھوپڑی میں۔

انہوں نے اس کے پیروں میں زنجیریں بھی باندھیں۔ ایک پنڈلی کی ہڈی ابھی تک دُکھتی تھی مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہ بے دانہ پڑی زمین کی طرح سیراب ہوتی رہی اور اپنے آپ میں ہی اُبل کر خشک ہوتی گئی۔

بہت بڑا عرس ہونے والا تھا۔ اکرم کی ماں نے مہینوں پہلے سے تیاری کرنا شروع کر دی۔ جو چادر اُس نے چڑھانے کے لئے بنوائی تھی اُس کے دھاگے دھاگے میں زری اور ستارے بھرے تھے۔ اصلی کپڑا تو کام کی جگمگاہٹ

میں غائب ہو گیا تھا۔ بن کر آئی تو کمرے میں روشنی سی ہو گئی۔ ماں بیٹے دونوں کو یقین تھا کہ اس چادر کو چڑھانے کے بعد جب وہ گڑگڑا کر دعا مانگیں گے تو اُن کی آرزوئیں ضرور پوری ہوں گی۔ جس دن انہیں جانا تھا۔ صبح سے ہنگامہ شروع ہو گیا۔

"یہاں سے موٹر پر جائیں گے پھر سڑک پر اُتر کر تین میل پیدل چلنا ہو گا"——— اکرم نے کسی مہمان سے کہا جو انہیں رخصت کرنے آیا تھا۔ رابعہ چونک کر سیدھی بیٹھ گئی اور پیروں کے تلوے دیکھنے لگی۔ چند مہینے پہلے وہ اسی طرح کہیں گئے تھے۔ دھوپ کتنی تیز تھی۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے کمزور پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے جن سے ہفتوں پانی رستا رہا اور وہ تکلیف اور مجبوری سے چپ چاپ روتی رہی تھی۔ رابعہ کو خوف محسوس ہونے لگا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ تلووں میں ابھی سے آگ لگتی محسوس ہوئی۔ اور آبلوں کی تکلیف دماغ کی بیچکی ہوئی سطح پر رینگنے لگی۔

"م——— م———" اُس نے اکرم کو مخاطب کیا۔ جو تیزی سے کمرے کے باہر جا رہا تھا۔ اکرم اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔ آج جانے کتنے عرصے کے بعد وہ اُس سے مخاطب تھی۔ چڑھاوے کی کرامات ابھی سے نظر آنے لگیں۔ وہ جھک کر رابعہ کی بات سننے لگا۔

"م——— م———" رابعہ کو بولنے میں بہت مشکل ہو رہی تھی

مہینوں کے بعد آج وہ بولنا چاہتی تھی۔ اپنی کسی خواہش کا اظہار کرنا چاہ رہی تھی۔ زبان اور آواز اُس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تک گھُٹی گھُٹی آواز میں ہکلاتی رہی پھر خاموش ہوگئی۔ اکرم آگے بڑھ گیا تو تلووں میں دوبارہ چنگاریاں سی بھر گئیں۔ اُس نے تڑپ کر اکرم کو آستین سے تھام لیا اور تھوڑی دیر تک بے بسی سے اُسے تکتی رہی پھر اپنے کمزور پیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رک رک کر بولی۔

"میں ـــــ ننگے ـــــ پیر دھوپ میں نہیں چل سکتی۔"

"کیا کہا؟ ـــــ نہیں چل سکتیں اور یہ سب کچھ کس کے لئے ہو رہا ہے؟ چلنا پڑے گا سمجھیں؟" ـــــ اکرم نے اُسے دونوں ہاتھوں میں سختی سے تھامتے ہوئے کہا۔ اور جھٹکے سے دروازے کا پردہ ہٹا کر باہر چلا گیا۔ گول گول رولر جس میں پردہ لٹکا تھا، پردے سمیت رابعہ کے اوپر گر پڑا۔ آہستہ آہستہ اُسے کئی سال پہلے دوپہر میں دیکھا ہُوا خواب یاد آنے لگا۔ وہ بیچ کی کڑی اُس کی انگلیوں میں اُلجھنے لگی جسے تھام کر وہ گول مٹول، گداز ہاتھوں والا بچہ اُس کی چھاتیوں میں گھُسر پھُسر کر کے منہ مارنا چاہتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اُس نے رولر کو پردے میں سے نکال لیا۔ اکرم اُسے گھورتا ہوا اندر داخل ہُوا تو رابعہ کے تلووں میں پھر سے جلن ہونے لگی۔ جیسے تپتی ہوئی ریت میں پاؤں اندر دھنستے جا رہے ہوں۔ اُس نے پوری

قوت سے پیر باہر نکالنے کی کوشش کی اور دانت پیس کر ہاتھوں میں پکڑا ہوا رولر اکرم کے سر پر دے مارا۔ اکرم چکرا کر گرا تو وہ جنون میں اور بھی قوت سے اُس کے سر پہ ڈنڈے کے وار برسانے لگی۔

"تم اپنا علاج کیوں نہیں کراتے ——— کیوں نہیں ——— ——— کیوں نہیں ———" تپتی ہوئی ریت میں کہیں سے خون کی لکیر بہہ نکلی اور وہ حیرت سے اُسے تکنے لگی۔

کمرے میں کتنا ہجوم اور ہنگامہ تھا۔ بیچ میں اکرم خون میں لت پت ابھی تک پڑا تھا۔ کوئی دوڑ کر اندر گیا۔ سامنے چوکی پر رکھی جگ مگ کرتی چڑھاوے کی چادر اٹھا لایا اور اکرم پر ڈال دی۔

تمغہ

جھٹ پٹے کا وقت تھا جب ہم زاہد کے گھر پہنچے وہاں خوب رونق تھی۔ زاہد کی بیوی رخسانہ بے حد مسرور، ہنس ہنس کر فخریہ انداز میں آنے والوں کا استقبال کر رہی تھیں۔ ہم نے دونوں میاں بیوی کو پھولوں کے ہار پہنائے اور گلے لگ کر مبارکباد دی۔ میز پر ہاروں اور مٹھائی کے ڈبّوں کا انبار لگا تھا۔ پھولوں کے بیچ میں پڑی ہوئی پنّی کے ٹکڑے بجلی کی روشنی میں چم چما رہے تھے۔ زاہد کو دشمن کا لڑاکا طیارہ گرانے، اور بے جگری سے لڑنے پر "تمغۂ جراُت" ملا تھا۔ اور اسی خوشی میں مبارکباد دینے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

زاہد میرے شوہر کا بہت پرانا دوست ہے۔ دونوں کالج میں ساتھ پڑھتے تھے پھر بی ایس سی کے بعد وہ ایئر فورس میں چلا گیا۔ زاہد کی چھوٹی بہنیں

اسکول اور کالج میں میرے ساتھ تھیں۔ بڑی جوشیلی اور لڑنے مرنے کے لیے
تیار۔ زاہد اُن کا دیوتا سمان بھائی تھا جس کے بارے میں وہ عقیدت اور محبت
سے یوں گفتگو کرتیں کہ ہم سب کے چھکے چھوٹ جاتے۔ جی چاہتا ہمارا بھی کوئی
ایسا لمبا تڑنگا حسین و جمیل بھائی ہوتا جس کی غیر معمولی بہادری اور ذہانت
کا چرچا کر کے ہم اپنی سہیلیوں کو مرعوب کیا کرتے۔ زاہد کی بیوی رُخسانہ بھی
پڑھی لکھی تھی۔ اُن کی دو بہت پیاری بچیاں تھیں جنہیں رخسانہ گڑیوں کی طرح
سجا بنا کر رکھتی تھی۔ اُن کے گھر کا ماحول بڑا پرسکون اور دل آویز تھا۔ یوں
بھی چھاؤنی میں ایک آرام دہ، نیند بھری کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔
اونچے اونچے گھنے پیڑ جن پر منہ اندھیرے اور سرِ شام چڑیاں اپنی چہچہاہٹ
کے تارے چھیڑا کرتی ہیں۔ ڈھلوان چھتوں کے یہ گھر اندر سے بڑے ٹھنڈے
اور آرام دہ معلوم ہوتے ہیں۔

ہم سب جالیوں سے ڈھکے برآمدے میں گدے دار کرسیوں پر بیٹھے
تھے۔ نوکر چائے کے ساتھ مٹھائی اور میوے پیش کر رہا تھا۔ زاہد مہمانوں کو
اصرار کر کے کھلا پلا رہا تھا۔ رخسانہ کبھی ہمارے پاس بیٹھتی کبھی بچیوں کو دیکھتی
اور کبھی باورچی خانے میں خانساماں کو ہدایت دینے چلی جاتی ———— بس
کمانڈر اپنی بیوی کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ انہیں تمغۂ جرأت سے بھی بڑا
کوئی اعزاز ملا تھا مگر زاہد اور رخسانہ سے ان کے بہت خوشگوار تعلقات

تھے اور ان کے اصرار پر آج کی شام وہ دونوں میاں بیوی زاہد کے گھر گزار رہے تھے ۔ غرض بڑی والہانہ محبت اور رفاقت کا ماحول تھا ۔ جنگ ختم ہوئے ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا اور اُسی کی باتیں ہو رہی تھیں ۔ فوج کی بہادری اور ایک ایک فوجی کے کارناموں کا ذکر عام تھا ۔ حکومت نے اعلان کیا تھا کہ سڑکوں کے نام تبدیل کر کے شہید ہونے والوں کے نام پر رکھے جائیں گے ۔

" اُن دنوں کیا کیفیت تھی مَیں بیان نہیں کر سکتی ۔"

بس کمانڈر کی بیوی بتا رہی تھیں ــــــ " ہمارے جوان ہوائی جہاز لے کر اڑتے اور دشمن کے طیاروں کو نرغے میں لے لیتے ۔ ہر شخص جان دینے پر تُلا ہُوا تھا ۔" میرے جسم میں سنسنی پھیل گئی ۔

" ہم عورتیں اکٹھا ہو کر آیتِ کریمہ کا وِرد کیا کرتے اور فوج کی کامیابی کی دعا مانگتے ۔ کیسا عجیب وقت گزرا ہے ۔" انہوں نے محبت بھری مسکراہٹ سے رخسانہ کو دیکھتے ہوئے کہا ۔

" ہاں ان دعاؤں اور منتّوں کا ہی اثر تو تھا کہ دشمن کے جہاز بم پھینکتے مگر انہیں زمین پر گرنے سے پہلے ہی فرشتے اپنی جھولیوں میں بھر لیتے ۔" ـــــ ایک مہمان خاتون یہ کہتے کہتے عقیدت اور روحانی جذبے سے سرشار ہو کر رو پڑیں ۔

سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرے شوہر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اُن کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ ضرور کوئی بے تکی بات کرنے والے ہیں جیسی کہ ان کی عادت ہے۔ مگر وہ جھک کر سگریٹ جلانے لگے۔ اس وقت مجھے اپنے شوہر کی کالج میں پروفیسری، ان عورتوں کے وردی پوش شوہروں کے مقابلے میں بڑی حقیر اور گھٹیا معلوم ہو رہی تھی۔ یہ سب کتنے جوان، صحت مند اور پُر اعتماد تھے۔ چہرے پر ایک بل نہیں۔ چکنے! صاف شفاف!

"کاش یہ بھی فوج میں چلے گئے ہوتے تو آج کتنے بڑے افسر ہوتے"
میں نے اپنے شوہر کے اڑتے بالوں اور چہرے پر فکرمندی کی لکیروں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

کالج میں جس لڑکی کی شادی کسی وردی پوش کیپٹن یا لیفٹیننٹ سے ہوتی اُسے بہت خوش قسمت سمجھا جاتا۔ جن لڑکیوں کے رشتے کسی فوجی افسر کے لئے آتے ان کے والدین فخریہ سب کو بتاتے۔
"ہماری بیٹی کے لئے فلاں کیپٹن کا رشتہ آیا ہے" ـــــ
ـــــ عموماً بہترین اور حسین لڑکیاں افسروں سے ہی بیاہی جاتیں۔ میری جیسی معمولی اور غیر اہم لڑکیوں کی قسمت میں بھلا ایسے بانکے سجیلے کہاں؟ ـــــ ہم جیسیوں کو تو گھس گھس کرتے، قلم گھسیٹنے والے

جھکے جھکے، مسکین صورت شوہروں پر ہی قناعت کرنی پڑی۔

خیر اپنا اپنا مقدر! — میں ذکر کر رہی تھی جنگ کے زمانے کا۔ دشمن کو شکست دینے کے جنون نے ملک میں ایسی جوشیلی فضا قائم کر دی تھی کہ ہر شہیدِ وطن کے ساتھ یہ جوش دُگنا ہو جاتا۔ لوگ باتیں کرتے تو یوں لگتا جیسے اِن کے ہونٹوں اور آنکھوں سے آگ کے گولے اور بندوق کی گولیاں برس رہی ہیں۔ پورا ملک چاند ماری بن گیا تھا۔ انتہائی بزرگ اور سنجیدہ قسم کے لوگ رضا کار کمیٹیوں میں شریک ہو رہے تھے۔ یہ رضا کار گھر گھر بہادر فوجیوں کے لئے کمبل، کھانے پینے کی چیزیں اور نقد رقمیں جمع کرتے پھرتے۔ شہریوں کی کمیٹیاں رات بھر گلیوں میں پہرے دیتی تھیں اور جہاں کسی گھر میں سے روشنی کی ہلکی سی لکیر باہر آتی شور مچ جاتا۔ سارے محلے میں ہڑبڑاہٹ پھیل جاتی۔ ایسے لوگوں کو غدار اور دشمن کا جاسوس کہہ کر اتنا شرمندہ کیا جاتا کہ وہ اپنی حب الوطنی اور افواج سے محبت کو ثابت کرنے کے لئے خود بلیک آؤٹ کروانے میں پیش پیش ہو جاتے۔

ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہوا کہ کراچی سے پچیس میل دور دشمن چھاپہ مار اترے ہیں۔ اگر کسی کو ملیں تو انہیں پولیس کے حوالے کر دے۔ پھر کیا تھا۔ پورا شہر ان کی تلاش میں لگ گیا۔ دو جاسوسوں کو لوگوں نے پکڑ بھی لیا۔ ایک ساٹھ پینسٹھ برس کے بڑے میاں اور اُن کی بیوی بس میں سفر کر رہے تھے۔

"تم کون ہو؟"

"ہم ہندوستانی ہیں"۔ بڑھیا نے جو چوڑی دار پاجامہ، پہ لمبا سا کرتا پہنے تھی پوپلے منہ سے ٹھیٹ پوربی لہجے میں جواب دیا۔

"ہندوستانی؟"

"پھر ہم انگستیج دِکھت ہیں کا؟"

"ہندوستانی!" ــــــ نفرت اور جوش کے مارے بس میں بھگدڑ مچ گئی۔ قریب تھا کہ مسافر دونوں بڈھے بڑھیا کی تِکّا بوٹی کر دیتے کہ ایک نسبتاً سمجھدار مسافر نے انہیں ٹھنڈا کیا۔

"اگر یہ ہندوستانی جاسوس ہیں تو انہیں تھانے لے چلو وہ لوگ ان سے دشمن کے راز اگلوالیں گے۔ مارنے سے کیا فائدہ؟"

"جاسوس ہوں گے تمہارے ہوتے سوتے"! پورے راستے اور تھانے میں بڑھیا پکڑنے والوں کی سات پشتوں کو کھنگالتی رہی۔ بڑی مشکل سے یہ معلوم ہوا کہ دونوں میاں بیوی اپنی بیٹی کے گھر جو فیڈرل بی ایریا میں کہیں رہتی ہے جا رہے تھے۔ اب پولیس نے اُن کے بیٹی داماد کو پکڑ لیا اور اُن سے پوچھ گچھ کرنے لگی۔

"اور آؤ پاکستان دیکھ لیا اپنا حشر" ــــــ بڈھا بڑی بی کے کوسنوں اور گالیوں کے آخر میں ہر مرتبہ یہ جملہ ٹانک دیتا۔

اسکول بند ہو گئے تھے۔ بچّے دفتروں، دوکانوں اور گھروں میں فوج کے لئے چندہ اکٹھا کر رہے تھے مکمل اور کامیاب بلیک آؤٹ کے لئے گھر گھر کھڑکیوں کے شیشوں پر موٹے موٹے سیاہ کاغذ چپکا رہے تھے۔ لڑکیاں خاکی وردیوں میں فوجی تربیت حاصل کر رہی تھیں۔ دفتروں میں برائے نام حاضری ہوتی تھی۔ جو لوگ آفسوں میں جاتے وہ تمام وقت میزوں پر پاؤں چڑھائے چائے پیتے ہوئے جنگ کی باتیں کیا کرتے۔ رات ہونے والے ہوائی حملوں کا ذکر ہوتا اور بار بار جمائیاں لی جاتیں کہ نیند کہاں پوری ہوئی تھی۔ تنخواہوں میں سے بڑی بڑی رقمیں فوجی فنڈ کے لئے کاٹی جا رہی تھیں۔

شاعر ملک اور فوج کی شان میں قصیدے اور نظمیں لکھ رہے تھے۔ جنہیں ریڈیو اور ٹی وی پر نامی گرامی فن کار اس ولولے سے گاتے کہ ریڑھ کی ہڈی سرکتی ہوئی معلوم ہوتی اور یقین ہو جاتا کہ عنقریب ہم دہلی کے لال قلعے پر جھنڈے لہرا دیں گے۔ بڑی بڑی کمپنیاں اور تجارتی ادارے اپنی اشتہاری فلموں اور گیتوں میں اس جوش و خروش کے اظہار کے لئے ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔

"پاکستانی بڑے لڑیّا، ان کی سہی نہ جائے مار"۔ اور اسی قسم کے دوسرے مصرعے اخباروں میں چھپنے والے اور ریڈیو، ٹی وی سے نشر ہونے والے اشتہاروں کی شان بڑھاتے۔ دوکانداروں کی بن آئی تھی۔ سڑا گلا، پرانا دھرانا

سب سامان تیزی سے بک جاتا تھا۔ لوگ حسبِ توفیق اپنے گھروں میں کھانے پینے اور ضروریات کی دوسری چیزیں اندھا دھند خرید کر بھر رہے تھے۔

ہمارے پڑوسی کا بیٹا فوج میں میجر تھا۔ دو گھنٹے کی چھٹی لے کر گھر والوں سے ملنے آیا۔ ابھی اس کی جیپ دروازے پر آکر رکی ہی تھی کہ محلّے والوں نے گھیر لی میجر کے گرد اور مٹی میں اٹے جوتوں اور وردی کو چوم چوم کر صاف کر دیا۔ ہر گھر سے کھانے کی سینیاں سج سج کر وہاں پہنچنے لگیں۔ لوگوں کی یلغار اس قدر بڑھی کہ میجر کے والد کو شربت کا ایک پورا مٹکا دروازے پہ رکھوانا پڑا کہ جو آئے پیتا جائے۔ میجر کو بہ مشکل نہانے اور ماں کو سلام کرنے کی مہلت ملی۔ اُس کے رخصت ہو جانے پر لوگوں کا کچھ بس نہ چلا تو ماں باپ کو ہی ہاروں سے لاد دیا۔ زیادہ جوشیلے تو نوٹوں کے ہار بنا لائے۔ غرض ملک اور مذہب پر جو کڑا وقت آن پڑا تھا اس کے لئے تن من دھن کی قربانی کے لئے لوگ تیار تھے۔

"افسروں کی بیویاں میری صورت سے نفرت کرنے لگی تھیں"۔ بیس کمانڈر کی بیوی نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

"اور ——— وہ کیوں؟" ——— میں ان کی بے حد پیاری صورت اور حسین جسم اور ان کے شوہر کے شاندار قد و قامت پر ہزار جان سے فریفتہ ہو رہی تھی۔

"میں چونکہ بیس کمانڈر کی بیوی تھی اس لئے صبح جب بھہانے لے کر

پائیلٹ اڑتے تو ناموں کی فہرست میرے پاس آتی اور خدانخواستہ کوئی پلٹ کر نہ آتا تو اُس کا نام بھی سب سے پہلے مجھ کو ہی معلوم ہوتا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا میری صورت دیکھ کر عورتیں چیخیں مارنا شروع کر دیتیں۔ میں یونہی ملنے جاتی تو سمجھتیں آگئی کوئی منحوس خبر لے کر۔"

"شہید ہونے کی خبریں سنکر عورتیں خوش نہیں ہوتی تھیں؟ اخباروں میں تو میں پڑھتی تھی کہ مائیں فوراً دوسرے بیٹے کو محاذ پر بھیج دیا کرتی تھیں اور بیویاں اور بہنیں، شوہروں اور بھائیوں کو رخصت کرتے ہوئے کہتی تھیں شہید ہو جانا مگر بھگوڑے نہ کہلانا وغیرہ وغیرہ۔"

"ہٹاؤ یہ باتیں بس حوصلہ بڑھانے کے لئے ہوتی ہیں"—— بیس کمانڈر کی بیوی نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ پھر ایک دم سے سنبھل کر بولیں۔

"دیکھو وقتی خوف دہراس بہادر سے بہادر شخص کو تھوڑی دیر کیلئے ماؤف کر دیتا ہے۔ شہید ہونے والوں کی بیویوں اور گھر والوں کو بہت عزت اور اہمیت ملتی ہے مگر آخر وہ بھی انسان ہیں۔"

"ہاں آخر وہ بھی انسان ہیں"—— میں نے سر ہلا کر اتفاق کیا۔

مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ زاہد اور رخسانہ نے ہم دونوں کو اور بیس کمانڈر اور ان کی بیوی کو اصرار کر کے کھانے کے لئے

روک لیا۔

"یار تمغہ تو دکھاؤ" ——— میرے شوہر نے زاہد کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

رخسانہ خواب گاہ سے ایک مخملی کیس اٹھا لائی اور بڑے احترام سے ڈھکن کھول کر میز پر رکھ دیا۔ ہم سب نے باری باری سبز فیتے میں پڑے اس جگمگاتے بہادری کے تمغے کو دیکھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں" ——— زاہد نے کیس بند کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بہت عمدہ زمینیں بھی ملی ہیں۔"

"اچھا زمینیں بھی ملی ہیں؟" ——— میرے شوہر نے حیرت کا اظہار کیا۔

"تو کیا اتنے بڑے کارنامے پر بس تمغہ ہی ملے گا؟۔ سندھ میں نہایت عمدہ نہری زمین ہے۔"

ایک میرے شوہر ہیں برسوں لگا کر کتابیں لکھتے ہیں جنہیں کوئی پبلشر چھاپتا بھی ہے تو ایک پیسہ معاوضہ نہیں دیتا۔ میں کچھ روہانسی ہو گئی، مگر جلد اپنے اوپر قابو پا لیا۔

"کبھی وہاں چلنے کا پروگرام بناؤ" ——— رخسانہ نے تجویز پیش کی۔

"بہت اچھا خیال ہے۔ جب تم لوگوں کو فرصت ہو"۔۔۔۔۔ زاہد نے میرے شوہر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ اگلے ہفتے چلیں"۔۔۔۔۔ میں نے جھٹ جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا میرے شوہر ٹالنے کی بات شروع کر دیں گے۔ مجھے تو زاہد اور رخسانہ کے اس چھاؤنی والے گھر میں ہی اس قدر سکون ملتا تھا۔ تو وہاں کھلے میدان کھیت اور نہریں۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ سوچ کر دل و دماغ میں تراوٹ سی دوڑ گئی۔

یہ مسئلہ طے ہو گیا۔

"کھانا لگ گیا"۔۔۔۔۔ نوکر نے آکر اطلاع دی۔

ہم سب کھانے کے کمرے میں چلے گئے جہاں میز پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ زاہد نے سب کی نشستوں کا فیصلہ کیا۔ کون کہاں بیٹھے گا۔

"تم اپنی بیوی کے قابل نہیں"۔۔۔۔۔ اس نے ہنستے ہوئے انگریزی میں میرے شوہر سے کہا اور میرے لئے اپنے برابر والی کرسی گھسیٹ دی نشست و برخاست طور طریقے اور کھانے پینے کے ڈھنگ اور آداب ان اعلیٰ افسروں پر ختم ہیں۔ رخسانہ، بیس کمانڈر کے برابر میں اور بیس کمانڈر کی بیوی میرے شوہر کے قریب یوں ہم سب بیٹھ گئے۔ کھانا بہت عمدہ تھا۔

"میں بتانا بھول گئی، امی کا فون آیا تھا وہ لوگ لاہور واپس آ گئے"۔

رخسانہ نے یاد کرتے ہوئے زاہد کو اطلاع دی۔ اُس کا میکہ لاہور میں ہی تھا۔

"تقریباً آدھا شہر خالی ہو گیا تھا" بیس کمانڈر نے کہا۔

"ہاں مجھے یاد آیا"— میرے شوہر نے ہنستے ہوئے کہا " لاہور کے ایک بہت بڑے ادیب ہیں جنہیں میں بھی جانتا ہوں۔ کل یہاں اُن کے پڑوسی سے ملاقات ہوئی وہ بتا رہے تھے کہ جب جنگ چھڑی تو ہمارے یہ دانشور دوست سرکاری جیپ میں علی حیدر، علی حیدر کا نعرہ لگاتے، جنگی ترانے گاتے، سڑکوں پر گھومتے تھے۔ پھر ایک دن اچانک بیوی بچوں سمیت غائب ہو گئے۔ اور گھبراہٹ میں اپنا پالتو کتا بھول گئے۔ بے چارہ جانور بھوک پیاس سے بے تاب ہو کر بُری طرح بھونکنے لگا تو اُن کے پڑوسی نے دیوار پھاند کر اُسے نکالا اور اپنے گھر لے گئے۔"

"کمال ہے ایسے بدحواس لوگ بھی ہوتے ہیں۔" بیس کمانڈر کی بیوی جو چند منٹ پہلے اپنی پالتو بلّی کا ذکر بڑے پیار سے کر رہی تھیں ناگواری سے بولیں۔

کچھ دیر تک سب خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ "زاہد بھائی اتنے بڑے جہاز کو گراتے ہوئے کیا کیفیت تھی آپ کی ؟" مچھلی میں سے کانٹا نکالتے ہوئے میں نے خاموشی توڑی۔

"بی بی اُس وقت کچھ ہوش نہیں تھا۔ بس مرنے اور مارنے کی دُھن تھی۔"

"اوہ ———" میں جھنجھنا اٹھی۔

"ہاں ! دوسرے روز جب سب کچھ ٹھنڈا ہو گیا تو ہم کئی افسر اُس میدان میں پہنچے جہاں جہاز گرا تھا۔ دُور دُور تک اُس کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ اور سارے میدان میں جلے گوشت کی بُو پھیل رہی تھی۔"

مَیں نے جلدی سے نوالہ نگل کر پانی کا پورا گلاس حلق میں انڈیل لیا اور غور سے سننے لگی۔

"اچانک ہمارے ایک ساتھی کی نگاہ ڈھلپنچے کے قریب ایک ہاتھ پر پڑی ہتھیلی تک کٹے اس پنجے کی درمیانی انگلی میں ایک سونے کی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ انگوٹھی ہم نے اتار لی ———"

"اور ہاتھ ؟" ——— میرے شوہر کی گردن کی رگیں تن گئی تھیں۔ اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

"ہاتھ ——— معلوم نہیں کس نے اُس ہاتھ کو سب سے پہلے جوتے سے ٹھوکر لگائی۔ بس پھر ہم سب ٹوٹ پڑے اور اُس ہاتھ کو فٹ بال کی طرح پیروں سے اچھال اچھال کر خوش ہوتے رہے جی چاہا دشمن کے ایسے کئی ہاتھ مل جائیں اور ہم انہیں خوب ٹھوکریں ماریں مگر اچانک ہمارے ایک ساتھی نے ہاتھ کو اپنے جوتوں سے کچلنا شروع کر دیا اور ہم سب نے باری باری اُس ہاتھ کو اتنا کُچلا کہ وہ قیمہ سا بن کر میدان کی مٹی میں مل گیا" ——— زاہد اپنے سفید ہاتھوں

میں بڑا سا کباب تھامے، پلیٹ میں رکھی سلاد کے ساتھ ملا کر کھانے لگا۔

میں نے اپنا کانٹا نیچے رکھ دیا۔ سفید براق چادر پر سجے سالن کے ہر ڈونگے میں مجھے کٹے ہوئے ہاتھ تیرتے نظر آ رہے تھے جن کی درمیانی انگلی میں سونے کی انگوٹھی کے اندر تمغۂ جرأت کے چھوٹے چھوٹے چاند ٹنکے ہوئے تھے۔

میَں نے دونوں ہاتھوں سے منہ جکڑ کر بند کر لیا اور اپنی تمام قوتِ ارادی کو کام میں لاتے ہوئے شائستگی کے آداب برقرار رکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

دھارا

موٹر شہر سے نکلی تو اس نے سیٹ کی پُشت سے سر ٹکا دیا اور شیشہ کھول کر ایک گہرا سانس لیا۔ برسات کی ہوا کومل اور ٹھنڈی تھی۔ وہ کھڑکی سے سر نکال کر باہر دیکھنے لگی۔ دُور دُور تک سبزے کا چھڑکاؤ سا کیا ہوا لگتا تھا۔ کہیں گہرا سبز، کہیں دھانی، کہیں گھنا اور دبیز، کہیں چھدرا چھدرا جیسے بچے کھچے رنگ کھنگال کر یہاں وہاں پھینک دیئے گئے ہوں۔

"اب کدھر ہے؟" فاروق نے اسٹیئرنگ دبا کر پوچھا۔

"کہیں بھی"۔ وہ مست سی ہو رہی تھی۔

"سجاول چلیں ہم؟"

"چلو" —— اس نے ہاتھ باہر نکال کر ایک اُڑتی بوند پکڑنے کی کوشش کی۔ بکھری بکھری سی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ سامنے حدِّ نظر کے

احاطے میں دھوپ چھاؤں کا کھیل جاری تھا۔

"نہیں"۔ اُس نے فاروق کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو روک دیا وہ ریڈیو پر کوئی اسٹیشن ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "آج ہوا، بادل، آسمان اور زمین کی آواز سُنیں گے"۔

"اخاّہ" وہ شیشے میں دیکھ کر شرارت سے ہنسا۔ "بول اری او دھرتی بول ——" وہ گنگنانے لگا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "شہر سے باہر ضرور نکلنا چاہیئے۔ پتہ ہے کیوں؟ —— اپنے بکھرے وجود کو سمیٹنے کے لئے آفس میں بیٹھے بیٹھے مَیں کتنے حصّوں میں بٹا ہوتا ہوں۔ گھر میں تمہارے ساتھ دفتر میں اپنے عملے کے ساتھ، فون پر اپنے CLIENTS کے ساتھ، ایڈیٹنگ کی میز کے اوپر کھٹا کھٹ چلتی فلم کے نگیٹیو میں الجھا ہوا، جو کمبخت ایڈیٹر کے پلّے نہیں پڑتی، اور پھر آج، کل، پرسوں میں بٹا ہوا —— صبح، شام، رات اور دوپہر میں تقسیم! اتنے تو شاید میرے جسم کے ٹکڑے بھی نہ بن سکیں"۔ وہ خوش دلی سے ہنس دیا۔ اچانک سنجیدگی کی ایک لہر اس کی آنکھوں میں آ گئی۔ سامنے ایک ٹرک پوری تیز رفتاری سے "پاں پاں" کرتا چلا آ رہا تھا۔ وہ گاڑی سائیڈ میں بچا لے گیا۔

"حرامی" اُس نے مُنہ میں گالی دی۔ کیچڑ کے ایک آدھ چھینٹے اُڑ کر اس کے مُنہ پر پڑے تھے۔

"ارے تم گاڑی میں بیٹھتے ہی گالیاں دینا کیوں شروع کر دیتی ہو"۔
آدھی سڑک پر موٹے موٹے چٹانی پتھر پڑے تھے۔ دو دو، تین تین کی ٹولیوں میں بٹے مزدور انہیں بے دلی سے کوٹ رہے تھے۔

"تب ہی تو گاڑیوں کا کباڑہ ہوتا ہے۔ اتنی اکتاہٹ میں بھلا کیا کام ہو گا۔" وہ جھلا کر بولی۔

"تم نے وعدہ کیا تھا کہ شہر کے باہر غصہ نہیں کرو گی، تنقید نہیں کرو گی اور چپکی بیٹھی ——"

"ہاں چپکی بیٹھی میری اور نیچر کی پوجا کرو گی۔"

"لا لا للا للا لا" صلح صفائی کے لئے وہ ہمیشہ ایسی ہی تان اڑانے لگتا۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو گئی۔

"سپر ہائی وے کے بعد تو یہ سڑک سنّاٹی ہو گئی تھی اب خاصی چہل پہل ہے۔" مزدوروں کی ایک ٹولی کو دیکھ کر وہ بول پڑی۔

"لوہے کا کارخانہ اور پورٹ قاسم۔"

"چلو چوکھنڈی کے قبرستان میں رکیں۔ ذرا دیر کے لئے مردوں سے ملاقات ہو جائے۔"

"شہر میں تو تم میرے رشتے داروں سے بیزار رہتی ہو اور شہر کے باہر بسے چاہے مردہ رشتے داروں کو بھی نہیں بخشتیں۔" فاروق نے اپنے راجپوت

خون کا حوالہ دیا۔

"اُدہو یہ خوش فہمی کب سے ہوئی کہ یہ تمہارے رشتہ دار ہیں۔"

"پتھر کا اتنا عمدہ کام ہماری برادری والوں کے سوا کوئی جانتا ہی نہ تھا۔" وہ جھک کر ایک قبر کی اینٹ دیکھنے لگا جس پر گلے، ہاتھ اور کانوں کے بڑے خوبصورت زیوروں کے نمونے کھُدے تھے۔

"ایسی مالا لوگی؟" اس نے شرارت سے پوچھا۔

"پتھر پہ؟ —— تم مجھے اس قبر کے اندر لیٹا ہوا دیکھنا چاہتے ہو۔ ہے نا!" اس نے چھیڑا۔

"نہ جانے کون تھے یہ لوگ؟ —— مگر معاشرہ ان کا بھی طبقاتی تھا۔ جو موت کے بعد بھی قائم رہا۔ امیروں کبیروں کی قبروں کے پائینتی چھوٹے موٹے کاریگر اور سپاہی بھی دفن ہیں۔ قبرستان میں شاید طبقاتی فرق کچھ زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔"

"کون تھے یہ لوگ کہ قبرستان بسا کے چل دیئے۔" وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔

"ہو سکتا ہے کہ یہاں صرف اپنے مُردے دفن کرتے ہوں اور رہتے دوسری بستیوں میں ہوں۔ پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا ہو۔ صدیوں کی چکّی نے انہیں سندھ کے دوسرے باشندوں میں اس طرح گھول دیا کہ اب ان کا الگ

وجود ہی باقی نہ رہا اور بس ایک قبرستان بچ گیا۔"

"کیا ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے میں گھلتے ملتے جاتے ہیں جیسے ایک بہت بڑے پیالے میں چینی کے چھوٹے چھوٹے دانے۔ جو پیالے کے پانی کو تو میٹھا کر دیتے ہیں مگر اپنی انفرادیت کھو بیٹھتے ہیں۔" وہ سوچتے ہوئے اپنے آپ سے مخاطب تھی۔

"ہاں مگر پانی کی مٹھاس چینی کے ہر دانے کی موجودگی کا احساس قائم رکھتی ہے تب ہی تو زندگی آگے بڑھ جاتی ہے اور فرد مر جاتا ہے"۔ فاروق نے ایک وزنی پتھر کو پاؤں سے ہلانے کی کوشش کی۔ پتھر اپنی جگہ جما رہا۔

چوکیدار سے کچھ لوگ بڑے پُر اسرار انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ کبھی چپکے چپکے کبھی اونچی آواز میں۔

"یوں ایک ایک پتھر یہاں سے کھسک کر بنگلوں کے باغیچوں اور بیٹھکوں کی زینت بن جاتے ہیں"۔ گاڑی میں بیٹھ کر چھوٹے تولئے سے مکھیاں اڑاتے ہوئے فاروق نے کہا ——" اور وہاں بھی طبقوں میں بٹ جاتے ہیں"۔

"دس بج گئے" —— اس نے گھڑی دیکھی۔

"گھڑی مجھے دے دو۔ آج ہم اپنے آپ کو وقت کے عذاب میں

بانٹنا نہیں چاہتے۔" فاروق نے گھڑی اس سے لے کر اپنی جیب میں رکھ لی۔

"اب؟"

"چلا چل چلا چل" کچے راستے پر وہ گاڑی آہستہ چلانے لگا۔
"بیل گاڑی یہاں کتنے دنوں میں پہنچتی ہو گی؟" ــــ اس نے سڑک کے کنارے ٹھمکتی ایک بیل گاڑی کو دیکھ کر یوں ہی پوچھ لیا۔
جُوئے کے بوجھ سے جُھکی بیل کی گردن دیکھ کر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "ہمارے تخیل سے بہت پہلے ــــ دیکھو نا جیسی زندگی ہم لوگ گذار رہے ہیں۔ اس میں ایک سوچ لمحے بھر کے لئے بھی نہیں ٹکتی کبھی کچھ اور کبھی کچھ۔ بیک وقت ہم اتنی بہت سی سمتوں میں سفر کر رہے ہیں کہ شاید کبھی کوئی منزل نہ بنا سکیں اور بنا بھی لی تو اس تک پہنچ نہ سکیں گے۔ اس بیل کی گردن دیکھتی ہو" اس نے گردن موڑتے ہوئے کہا ــــ "ہمارا وجود بھی اسی طرح جُھکتے جُھکتے پستیوں کو چومنے لگا ہے اور سوچ ــــ چیونٹی سے بھی کم رفتار ــــ نہ عنوان نہ ٹھکانہ ہانپتی ہوئی اور بے زبان ــــ مگر زندگی ــــ زُوم!" ــــ فاروق نے گاڑی ایک دم بہت تیز کر دی۔
"سیلف پٹی SELF PITY"
"چلو بھنبور چلیں" ــــ اس نے گاڑی دائیں جانب موڑ دی۔

"ہاں چلو میں کبھی کالج کے دنوں میں آئی تھی"۔ وہ سردیوں میں یہاں آئی تھی۔ اُس وقت پانی کی چھپھلی سی نیلی سطح رُکی رُکی سی اپنی جگہ کھڑی تھی۔ آج پانی نسبتاً گہرا تھا۔ دوسرے کنارے پر اونٹوں کا قافلہ قطار میں آہستہ آہستہ مغرب کی جانب رینگ رہا تھا۔

"محمد بن قاسم کے زمانے سے آج تک کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی"

"کچھ تو ہوئی ہے مثلاً ——"

"مثلاً ؟"

"ہم اور تم یہاں بیٹھے اپنے آپ کو بہت سی کمینگیوں سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا شکار ہو رہے ہیں"۔

"تم پروپیگنڈہ فلمیں بنانا بند کر دو"۔ اسے فاروق کا پست لہجہ اچھا نہ لگا۔

"ہم تو انٹی پروپیگنڈہ ہیں"۔ وہ چکنے پتھروں پر لیٹ گیا۔ "یہ پانی دیکھ کر بھلا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہاں کبھی جہاز رُکتے تھے، تجارت ہوتی تھی، مال لادا اور اُتارا جاتا تھا۔ حملہ آور آتے تھے، کچھ لُٹتے تھے"۔

"لُوٹنے اور لُٹنے کا سلسلہ تو آج بھی جاری ہے"۔

"اسی جگہ محمد بن قاسم اور راجہ داہر کی فوجوں کا پہلی مرتبہ مقابلہ ہوا"۔

"اور محمد بن قاسم آگے بڑھتا گیا"

"ہاں مگر میرا ہیرو راجہ داہر ہے"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک راجہ تمہارا ہیرو کیسے بن سکتا ہے؟"

"اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک جرنیل تمہارا ہیرو کیسے بن سکتا ہے؟"

"میں نے کب کہا کہ ایک جرنیل میرا ــــــ" اسے بہت بُرا لگا۔ اُس نے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں چکنے چکنے ایک سائز کے پانچ گول پتھر جمع کر لئے ــــ "بچپن میں ہم ان گٹیّوں سے بہت کھیلتے تھے" چار پتھروں کو نیچے رکھ کر اس نے ایک پتّھر ہوا میں اُچھال دیا۔ مگر اسے دوبارہ چار پتھروں سمیت نہ اُچک سکی۔

"میں اور میری بہن کھیلتے کھیلتے ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے بال اور منہ نوچ لیتے، پھر امّاں آکر خوب ڈانٹتیں" ــــ وہ بچپن کا زمانہ یاد کر کے ہنس دی۔

"اور اب تم بہن کے بدلے مجھ سے لڑتی ہو" ــــ فاروق نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بس گھوم پھر کر ہر موضوع اپنی ذات پر لانا تمہیں بہت پسند ہے"۔ وہ چڑ گئی۔

"ذات اہم نہیں ہے کیا؟"

"بہت اہم ہے۔ مگر ذات کو اپنے اوپر اور دوسروں پر مسلّط کرنا اور متوجّہ کرنے کی کوشش کرنا ہنھ—— انتہائی احمقانہ"—پچھلے چند دنوں سے ذات والوں سے اس کا جھگڑا چل رہا تھا۔

"اپن تو ٹیم ورک کرتے ہیں"—— فاروق بحث کے موڈ میں نہیں تھا—— جانے کہاں سے ایک آدمی چنے بیچتا ہوا نکل آیا۔ انہوں نے ایک ایک پڑیا خرید لی۔ بہت تیز مرچیں تھیں۔ چنے پرانے اور سیلے ہوئے تھے۔ وہ انہیں سمندر میں بہا کر چل دیئے۔

"کیا خیال ہے دریا کی تازہ مچھلی کھائی جائے"۔ مچھلی فاروق کی کمزوری تھی۔

"کیوں نہیں" دریا کی سوندھی مچھلی اُسے بھی بھاتی تھی۔

ٹھٹھہ سے کچھ پہلے وہ نہر کے قریب رُک گئے۔ پچیس سیر کا رُوہو پانی سے نکال کر ایک مچھیرا انہیں اپنا کانٹا دکھانے لگا۔ وہ چھوٹی مچھلی والوں کی جانب مڑ گئے۔ مچھیرے نے رُوہو واپس پانی میں ڈال دیا۔

"ہمّت چاہیئے ایسا جانور خریدنے کے لئے" وہ اپنے شکار کی توہین پہ ناراض لگتا تھا۔ آخر بڑی چیل حجّت کے بعد دو چھوٹے رُوہو ملے۔

ٹھٹھہ پہنچتے پہنچتے گرمی بڑھ گئی تھی۔ بکلی سے آدھی فرلانگ پر ایک ریسٹوران میں وہ رُک گئے اور ہوٹل والے سے مچھلی تیار کرنے کو کہا۔ پنکھے کی ہوا میں پسینہ سکھا کر وہ کھانے کا انتظار کرنے لگے۔ ریسٹوران جالیوں سے ڈھکا تھا اور نسبتاً صاف ستھرا۔ باہر برآمدے میں مکھیّ دن کی چادر سی بچھی تھی۔

مچھلی تل کر آئی تو پتہ چلا کہ آدھی سے زیادہ مچھلی دو دوسرے گاہکوں کو پانچ روپے فی پلیٹ کے حساب سے پیش کی جا چکی ہے۔ فاروق باورچی خانے میں گھس کر باورچی سے لڑنے لگا۔

"ایک دھیلا ٹپ نہیں دوں گا سالوں کو"——وہ غصّے میں بھنّاتا دھم سے آکر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ مچھلی کھانے لگا۔

"بے ایمانی کتنی بڑھ گئی ہے۔ یہ جو لوگ زیارت کر کر کے یہاں ٹھونسنے کے لئے آرہے ہیں سب بدمعاشی کا پیسہ لا کر خرچ کرتے ہیں اور مزاروں پر جا کر فاتحہ پڑھتے ہیں۔ منّتیں مانتے ہیں۔ پھر ہوٹل والا ان عقیدت کے ماروں کو ان کے ہی میدان میں مارتا ہے"——بھانت بھانت کے لوگوں کو ہوٹل میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ بڑبڑایا۔

"قبریں دیکھنے چلیں گے؟" وہ کھانا ختم کر کے بولی۔

"چھوڑو مزہ خراب ہو گیا" اُس نے چائے میں چینی ہلاتے

ہوئے مُنہ بنایا" اور آج تمہیں قبریں دیکھنے کا کیوں اتنا شوق ہو رہا ہے۔ کچھ زندہ انسانوں سے ملو۔ انہیں دیکھو۔"

"زندہ انسان تو سب بے ایمانیوں میں مصروف ہیں۔"

وہ سجاول جانے والی سڑک پہ ہو لیئے۔ بادشاہی مسجد کے سامنے کچھ سواریاں کھڑی تھیں۔ تھوڑی دور پہ ایک گدھا مرا پڑا تھا اور لاش کی بُو اِدھر اُدھر پھیلنے لگی تھی۔ مسجد میں سجاوٹ اور مرمت کا کام جاری تھا۔ لوگ جُوتے اُتار کر مسجد کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پیر چل رہے تھے۔ بچّے بھاگ رہے تھے۔ ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ان کے تیز تیز اُٹھتے، چھوٹے چھوٹے پیروں کے تلووں میں بُھربُھری لال مٹی سیندُور کی دُھول کی طرح جمتی اور جھڑتی تھی۔

ہو سکتا ہے اس میں سے کچھ گھر شہنشاہ اکبر کے زمانے کے ہوں یا اُس سے بھی پہلے کے" ــــــ ایک ٹُوٹے پھُوٹے دو منزلہ مکان کو دیکھ کر اُس نے قیاس آرائی کی جس کے چھجّے کی نقشی لکڑی جگہ جگہ سے اُکھڑی ہوئی تھی۔ مغلیہ طرز کی محرابیں اوندھی گرنے کو تھیں اور موٹے وزنی دروازے جن پہ ڈھیروں کام کیا ہوا تھا اپنی چوکھٹوں میں بس ٹکے ہوئے تھے۔

راستہ بہت ہرا بھرا تھا۔ بارش کے بعد پورا علاقہ نِکھرا نِکھرا سا لگتا تھا۔ پتّے ہوا میں جھُومتے ہوئے دھیمے سُروں میں تالیاں بجا رہے تھے۔

کہیں کہیں کھیتوں میں کوئی رنگ برنگی چادر لہرا جاتی یا آس پاس بنے ہوئے کچّے گھروں سے میلے کچیلے گندے جسموں والے بچّے بھاگتے ہوئے سڑک پار کر جاتے۔

"عام دنوں میں یہاں کتنی دھول اُڑتی ہوگی" —— اونچائی پر کچھ عورتوں کو گیہوں کے ڈھیر سے بھوسہ اُڑاتے دیکھ کر وہ بولی۔

"مجھے ایسے چائے خانے بہت پسند ہیں" سڑک کے کنارے ایک بوڑھے برگد کے نیچے چھپّر والی چائے کی دکان دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ وہیں بیٹھ کر چائے پئے۔ فاروق نے کنارے پر گاڑی روک دی۔ وہ دونوں ایک پُرانی سی لکڑی کی بنچ کو رومال سے جھاڑ کر بیٹھ گئے۔ چند دیہاتی، ایک شہری نوجوان جوڑے کو یوں بنچ پر بیٹھا دیکھ کر گھورنے لگے۔ ان کی نظروں میں تجسّس تو تھا پر کمینگی یا بدمعاشی نہیں تھی۔

بوڑھا برگد سکندرِ اعظم کے زمانے کا لگتا تھا۔ اُس کا تنہ اور جڑیں پچیس تیس گز کے دائرے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ سامنے کھیت میں ایک رہٹ نظر آرہا تھا۔ شاید بیکار تھا یا بہت دنوں سے استعمال نہیں ہوا تھا۔

کڑھے ہوئے دودھ کی چائے بہت مزے کی تھی۔ انہوں نے اس پر بالائی کی موٹی سی تہہ بھی ڈلوالی۔

"میری نانی بھی ہمیشہ دودھ کی چائے پیتی تھیں"۔۔۔۔ اس نے ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"اور کیا کرتی تھیں تمہاری نانی؟" وہ مسخرے پن سے بولا۔

"اور گالیاں بہت دیتی تھیں"۔ وہ کھسیا گئی۔

"سیلاب کا پانی ادھر آتا ہے؟" فاروق نے یوں ہی ہانک لگائی۔

"ہاں سائیں آتا ہے پر اس سال کچھ دیری ہو گئی ہے"۔۔۔ چائے خانے کے مالک نے لکڑیوں کو ایک دوسرے میں جوڑ کر چولہے کی آگ تیز کر دی۔

"دریا یہاں سے کتنی دور ہے؟"۔۔۔۔ اس نے پاؤں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کوئی دس بارہ میل ہو گا سائیں"۔۔۔۔ سامنے سنگِ میل پر "سجاول چار میل" لکھا تھا۔ دیہاتیوں کو وقت اور فاصلوں کا اندازہ ہمیشہ اپنی رفتار کے حساب سے ہوتا ہے۔

"مچھلی ملتا ہے؟"

"ملتا ہے بہت ملتا ہے پلّہ بھی مل جاتا ہے"۔

مٹیالے، گدلے پانی میں ایک آدھ کشتیاں چل رہی تھیں۔ کہیں دور پر مچھیرے جال پھینکے بیٹھے تھے۔ وہ پل کے نیچے رک گئے۔ اور ٹہلتے ہوئے

دوسری طرف آ گئے۔ بند کے ڈھلان پر کچھ گھر بنے تھے۔ ایک گندا سا کتا بان کی چارپائی پر پڑا اینڈ رہا تھا۔ ایک لڑکی کچے جھونپڑے سے باہر نکلی اور تسلے میں بھرا میلا پانی اُلٹ دیا۔ کُتے نے گردن اُٹھا کر دیکھا اور پھر لیٹ گیا۔ اسے کُتوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ خصوصاً گاؤں کے کتوں سے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ یہ کُتے بڑے خونخوار ہوتے ہیں اور کسی کو کھیت یا گھر کے قریب منڈلاتا دیکھ لیں تو چیر پھاڑ ڈالتے ہیں۔ وہ واپس پلٹ گئی۔ فاروق بہت سے میلے کچیلے بچوں کو جمع کرکے کیمرے میں سے جھانک رہا تھا۔

"تم بھی ان کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ۔ آؤ جلدی آؤ"۔۔۔۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے بُلانے لگا۔

"توبہ سیاحوں والی اس ذہنیت نے ناک میں دم کر دیا ہے"۔۔۔ وہ مُنہ بنا کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

"اُس کُتے کی تصویر نہیں لو گے کیا؟"

"پُل پر سے لیں گے۔ آؤ ٹہلتے ہیں"۔ وہ کیمرہ لٹکائے ہوئے بولا۔

دو چکنی، پھسلتی، لمبی گاڑیاں بند پر آ کر رک گئیں اور ان میں سے عورتیں مرد پھنس پھنس کر نکلنے لگے۔ بچے فاروق کو چھوڑ کر نئے آنے والوں کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے نوکر اور ڈرائیور ڈکی میں سے کھانے کے ڈبے پھلوں اور مٹھائیوں کی ٹوکریاں لوٹے، گلاس اور رنگ برنگی دریاں نکال کر

گاڑیوں کی اوٹ میں بچھا رہے تھے۔ عورتیں بہت قرینے سے دستر خوان پر
پلیٹیں سجانے لگیں۔ مرد کھانے کے انتظار میں بے دلی سے ٹہل رہے تھے۔
جیسے اتنا لمبا سفر انہوں نے صرف کھانا کھانے کے لئے کیا ہو۔
"اس کھانے کو ہضم کرنے کے لئے انہیں یہاں سے کراچی تک
پیدل جانا چاہیئے۔"
"تم ہر کسی سے جلتے کیوں ہو؟"
"نہیں میرے تصویریں کھینچنے پر تو اعتراض ہے اور ان لوگوں کے
اس قدر کھانے پر کچھ نہیں کہتیں۔"
وہ بغیر جواب دیئے آگے بڑھ گئی۔ ایک ٹرک تیز رفتاری سے گزرا
تو پُل ہلنے لگا۔ فٹ پاتھ پر جہاں وہ چل رہے تھے سیمنٹ کی سلیں کئی جگہ سے
اُکھڑ چکی تھیں اور کئی جگہ سے اُکھڑنے والی تھیں۔
"رات کے اندھیرے میں یہاں کوئی بھی گر سکتا ہے"۔ وہ پھونک پھونک
کر قدم رکھ رہی تھی جس طرف وہ چل رہے تھے ادھر پانی میں بیک وقت بہت سے
بھنور بن بن کر پھیل رہے تھے یوں جیسے دریا سمندر کی طرف جانے کے بجائے
واپس مڑنے کے لئے مچل رہا ہو، ایڑیاں رگڑ رہا ہو۔
"اگر دریا کے پاؤں ہوتے تو وہ واپس پہاڑ کی کوکھ میں ضرور جاتا کم
از کم ایک بار ضرور" —— فاروق نے کہنیاں ٹکا کر گھومتے، بل کھاتے

پانی کو دیکھا۔

"جنم لینے کے بعد کون سا بچّہ ماں کی کوکھ میں واپس گیا ہے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو شاید ہم سب اپنی ماؤں کی کوکھ میں مُنہ چھپائے پڑے ہوتے۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

جال میں کوئی بڑی سی مچھلی پھنسی تھی۔ مچھیرے جال کھینچ رہے تھے۔

"میرا دل چاہتا ہے کہ کشتی میں یہاں سے کراچی جاؤں بڑا دلچسپ سفر ہوگا۔"

وہ دیر تک چپ چاپ ٹہلتے رہے اور تھک کر پُل کے نیچے اُتر گئے۔ دری بچھائے ایک ملنگ کچھ موتی کنٹھے رکھے بیٹھا تھا۔ وہ بڑی سی پارٹی کھاپی چکی تھی۔ مرد ٹہل رہے تھے۔ بچّے کشتی کی سیر کے لئے مچل رہے تھے اور مائیں انہیں منع کر رہی تھیں ——— دو تین عورتیں ملنگ کے قریب بچھی ایک چارپائی پر بیٹھی اس کے کنٹھوں پر جُھکی ہوئی تھیں۔

"آؤ پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھیں۔" فاروق نے بند کے نیچے جمے ہوئے پتھّروں پر پاؤں رکھ کر آہستہ آہستہ نیچے اُترتے ہوئے کہا۔ جُوتے اُتار کر وہ بھی پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

"مزہ آگیا" ——— پائینچے اُوپر سَرکا کر وہ چھپ چھپ پاؤں مارنے لگے۔ پھر چلّو میں پانی بھر کر اسے مُنہ پر ڈالنا شروع کر دیا۔

"کتنا مٹیالہ پانی ہے"۔

"مٹیالا اور جاں بخش"۔

"جمنا کا پانی نیلا ہوتا ہے اور گنگا کا اجلا"۔

"تم ہمیشہ گنگا جمنا کو کیوں بیچ میں لاتی ہو۔ سندھ کے جیسا پانی تو دُنیا کے کسی دریا میں نہیں ہوگا"۔

"اس پانی کو چلّو میں بھر کر مَیں نے پیا تو اس کی مٹھاس اور بھلائی کی پہچان ہوئی"۔ بوند بوند پانی اس کے ہاتھ کی کٹوری میں سے ٹپک کر دریا میں گرنے لگا۔

"اس دریا کے ساتھ کیسے کیسے سورماؤں اور متوالوں نے سفر کیا ہے جانے اُس وقت یہ دھارا کس سمت میں بہتا ہوگا"۔

"اور سکندرِ اعظم کے اَن گنت سپاہی اس پانی میں چُہلیں کرتی گوریوں کو دل دے بیٹھے ہوں گے۔ پھر یونان جانے کا ارادہ چھوڑ کر یہیں کہیں آس پاس کھیتوں میں اناج اُگانے، گیت گانے کے لئے بستے گئے ہوں گے پھر ان کے بچے اور ان کے بچوں کے بچے ملے جلے پلتے بڑھتے گئے"۔

"ہمیں تاریخ پڑھنی چاہیئے۔ آدمی کو سمجھنے کے لئے۔ کتنا پیچیدہ ہے انسان کا آنا جانا اور گم ہو جانا۔ یاد ہے جب ہم پچھلے سال ٹکشلا گئے تھے؟"

"اور کسی نے کہا تھا کہ اُسے وہاں بدھ کا آسن دکھائی دیتا ہے"۔

"خبطی لگتا تھا"

"خبطی نہ کہو وہ تاریخ میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ یوں جیسے ایک پُرانا بند دروازہ کھول کر تم اپنے بچپن کی کھوج میں کہیں پیچھے نکل جاؤ"

اچانک فاروق کی نظر پل کے ستونوں پر پڑی۔ پانی ابھی خطرے کے نشان سے نیچے تھا۔

"پانی اُوپر آجائے گا تو آپ لوگ کہاں جائیں گے؟"

اس نے قریب کھڑے ایک کشتی بان سے پوچھا جو کشتی کو کنارے سے باندھ رہا تھا۔

"یہیں آس پاس کہیں کسی سوکھی جگہ میں یا پکے میں۔ پھر انتظار کریں گے پانی اُترنے کا"

"کتنا دن لگتا ہے پانی اُترتے میں؟"

"دس پندرہ دن کبھی اور زیادہ لیکن آخر اُترتا تو ہے نا پانی کبھی نہ کبھی کسی نا کسی ٹائم پہ ــــــ ہم لوگ پھر جم جاتے ہیں۔ مچھر بہت ہے۔ یہاں اتنا کہ بال بچّوں کو روز بخار آجاتا ہے۔ ادھر دوا بھی نہیں ملتا کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ہے۔ آپ لوگ کراچی سے آیا ہے؟"

"ہاں!"

"ہم گیا تھا ایک دفعہ کراچی۔ ہمارا تو بھیجہ پک گیا۔"

"ہمیں اپنی کشتی میں کراچی لے جاؤ گے؟" فاروق نے مسکرا کر پوچھا۔

بوڑھا قہقہہ لگا کر بہت زور سے ہنسا۔ "وہ تمہارا کشتی تو اُدھر کھڑا ہے۔"

اس نے دھوپ میں چمکتی چھوٹی سی موٹر کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تو ہمارا گھر ہے۔"

اس نے کشتی کو پیار سے تھپتھپایا۔

دوپہر ڈھل گئی تو وہ اُٹھ کر اوپر چڑھنے لگے، آہستہ آہستہ قدم جماتے، اچانک اُس کے ہاتھ سے پانی کی بوتل چھوٹ کر دریا میں گر پڑی۔ چند بلبلے بنے بوتل تھوڑی دیر تک ڈولتی رہی پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"جانے دو۔ اب سے دو سو سال بعد کسی کو ملی تو وہ اس کی بناوٹ پر حیران ہوتے ہوئے اسے اپنی بیٹھک میں سجا لے گا۔"

"مجھے معلوم ہوتا تو اُس کے اندر آج کی تاریخ لکھ کر ڈال دیتی۔" وہ پاؤں جھاڑ کر جوتے پہننے لگی۔

لالی

لالی گلے میں تھیلا لٹکائے کپاس کے پھول چن رہی تھی۔ اُس کی لال چندری میں کہیں کہیں روئی جم گئی تھی۔ کئی عورتیں سر جھکائے اِدھر اُدھر بکھری ہوئی چنائی میں مصروف تھیں۔ لالی اور اُس سے چھوٹی عمر کے بچے کام کرتے کرتے بھاگ دوڑ کرنے لگتے تو کوئی بڑی عمر کی عورت انہیں زور سے ڈانٹتی اور چلّا کر ہاتھ تیزی سے چلانے کا حکم دیتی۔ قریب ہی پن چکّی چل رہی تھی جس کی "کُنک ــــــ کُنک" فضا میں سما کر اُس کا حصّہ بن گئی تھی۔

لالی نے گردن پھیر کر دیکھا تو اُس کی ماں کھا تو سر پہ گٹھڑی رکھے تیز تیز قدموں سے چلی آ رہی تھی۔ لالی نے سوچا پیاز کے کھیت سے گھاس اور جنگلی پودے نکالنے آئی ہو گی۔ بکریوں کے لئے۔ اس کی ماں جس دن

کپاس کی چنائی نہ کرتی تو جانوروں کے لئے چارہ جمع کیا کرتی تھی یا آس پاس کے جنگلوں سے جلانے کے لئے لکڑیاں اکٹھا کرتی۔ وہاں ببول اور کیکر بہت ملتا تھا۔

ڈنٹھل پر غلط جگہ ہاتھ رکھنے سے لالی کی انگلی میں کانٹا چبھ گیا اور وہ "سی" کی ہلکی سی آواز نکال کر اپنی انگلی چوسنے لگی۔

"میری انگلی دکھتی ہے" ماں کو بالکل قریب دیکھ کر وہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے نخرے سے بولی۔ کپاس چنتے چنتے وہ اکتا گئی تھی اور کچھ دیر کھیلنا چاہتی تھی۔ اُسے اُمید تو نہیں تھی کہ ماں اُسے ہاتھ روکنے کی اجازت دے گی پر وہ عادت سے مجبور تھی۔ اپنی پیٹھ سیدھی کر کے وہ لبسورنے لگی۔ مگر آج ماں نے اسے کام چوری کرنے پر برا بھلا نہیں کہا۔ وہ بہت جلدی میں تھی اور پریشان لگتی تھی۔

"چل لالی جلدی چل" وہ اُس کے گلے سے کپاس کا تھیلا اتارتے ہوئے بولی۔

"کہاں ؟" جنگل میں جا کر لکڑیاں توڑنے کے خیال سے لالی کو الجھن ہونے لگی۔

"چل باتیں کیوں بناتی ہے" ــــ لالی کی ماں نے کپاس کا تھیلا کھیت میں پھینکتے ہوئے اسے گھسیٹا۔ لالی اپنی چٹیا کو جھٹکتے ہوئے اُس

کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کھاتو دوسری عورتوں سے نظریں بچا کر نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ سڑک پر پہنچی تو لالی نے پھر پوچھا۔

"ماں کدھر جا رہی ہے؟"

"بس کے اڈے پر" ——— اس کی ماں نے جواب دیا مگر اپنی رفتار میں کمی نہیں کی البتہ وہ ادھر اُدھر چوکنی نظروں سے دیکھتی جاتی تھی۔

لالی نے سڑک پر بسیں، موٹریں، لاریاں اور ٹرک چلتے تو بہت دیکھے تھے مگر آج تک وہ کبھی بس میں نہیں بیٹھی تھی۔ اُس کی بڑی بہن جو قریب کے گاؤں میں رہتی تھی۔ ہمیشہ پیدل آیا کرتی اور اُس کے آگے کی دنیا کا لالی کے لئے کوئی وجود نہ تھا۔

"ماں بس کے اڈے پر کیوں جا رہی ہے؟" ——— اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور اب کھاتو کے سر پر بڑی سی گٹھری اور گٹھری پر بندھے ہوئے چپلوں کو پہلی مرتبہ غور سے دیکھا۔

"ماں ہم کہاں جا رہے ہیں" دوڑتے ہوئے ماں کے پاس پہنچکر اُس نے منت سے پوچھا۔

"کراچی" ——— اُس کی ماں نے ذرا سا منہ کھولا اور زیادہ تیزی سے چلنے لگی۔

"کراچی" ——— لالی نے دل ہی دل میں نام دہرایا۔ کھاتو دو

مرتبہ کراچی گئی تھی وہاں اُس کے رشتہ دار رہتے تھے مگر۔ لالی کبھی نہیں گئی

تھا کوئی برس پہلے کسی شادی میں گئی تھی۔ تب وہاں سے ریشمی پچھلے

لائی تھی جو ابھی تک لالی کے بالوں میں گند ھے رہتے۔ کھا تو نے کراچی کی

بہت باتیں لالی کو بتائی تھیں۔ لالی کے پیٹ میں گدگدی ہونے لگی اور

اب وہ ماں سے زیادہ تیز چل رہی تھی۔ فی الحال کراچی جانے کی خوشی نے

اُس کے دماغ سے ہر سوال مٹا دیا۔

لالی کو بس میں کھڑکی کے قریب بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔ کنڈکٹر نے

اُن کی گٹھری چھت پر رکھ دی۔ بس دھکے سے آگے بڑھی تو ذرا دیر میں

لالی کی آنکھوں میں دنیا ناچنے لگی۔ کپاس کے سفید پھول پتے ہوئے تانبے

کی رنگت والے پتّوں میں گھرے تھے۔ کہیں کہیں سرسوں پھول گئی تھی اور

دور دور تک پیلے پھولوں کا سمندر ہوا میں لہریں لے رہا تھا۔ پیاز کی

پتیوں کے رنگ کتنے گہرے سبز تھے۔ ایک ہی نظر میں لالی نے پتیوں کے

کئی رنگ دیکھ لئے۔ بس جتنی تیز چلتی آس پاس کے کھیت، اُن کے نزدیک

بنے ہوئے کچّے مکان، کھیتوں میں کام کرنے والے مرد، عورتیں بچّے،

دُور چرتے ہوئے مویشی سب تیزی سے گھومنے لگتے۔ وہ سب کچھ بھول

کر اس کھیل کو برقرار رکھنے کے لئے پوری توجہ سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہ

جب اپنی سہیلیوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چک پھیریاں کرتی تو چند لمحوں

کے لیئے آسمان اور زمین اُس کے ساتھ ناچنے لگتے۔ مگر یہ انوکھا تجربہ تھا۔
کتنی دیر سے ہر چیز اُس کے سامنے ناچ رہی تھی۔ اچانک بس دھچکے کھانے
لگی۔ سڑک بہت ناہموار تھی۔ ناچ کا کھیل بند ہو گیا۔ لاآلی کو دھکے لگنے لگے
قریب ہی ایک جانور مرا پڑا تھا۔ لاآلی کھڑکی سے سر نکال کر اس کے قریب
بیٹھے ہوئے گدھوں کو دیکھنے لگی۔ سڑک کے پاس کسان ایک کھیت میں
درانتیاں لیئے گنّا کاٹ رہے تھے۔ کھچا کھچ ، کھچا کھچ —— اب دو
ایک روز میں گنّا پیلا جانے والا تھا۔ لاآلی کو تازہ گنّے کے رس کی مہک
بہت پسند تھی۔ جہاں کہیں اُسے گنّا پیلنے کی خوشبو آتی وہ پہنچ جاتی اور
بیلوں کو گھومتے دیکھا کرتی جن کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی جاتی تھیں
کبھی کبھار اُسے رس مل جاتا یا تازہ جما ہوا گڑ کا ایک ٹکڑا تو وہ گھر لا کر
روٹی سے کھایا کرتی۔ اُسے تھوڑا سا افسوس ہوا کہ وہ گنّے کی پیلائی کے
دنوں میں نہیں ہو گی۔

لاآلی کی ماں کھاتو شہدادپور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی
تھی اور کھیتوں میں مزدوری کرتی تھی۔ گذر اوقات کے لیئے اس نے دو بکریاں
بھی پال رکھی تھیں۔ جن کے دودھ کے بدلے میں وہ تھوڑی بہت جنس
حاصل کر لیتی۔ وہ ابھی پورے چالیس برس کی بھی نہیں تھی مگر چہرے اور
جسم پر دن رات کی محنت، فکروں اور پریشانیوں کے سبب شکنوں اور

جُھرّیوں کی بھرمار تھی۔ آواز بہت کرخت ہوگئی تھی اور بقول نانتھا وہ کسی کام کی نہ رہی تھی۔ لالی اپنے باپ نانتھے کو بہت کم دیکھتی تھی۔ وہ گھر میں ذرا سی دیر کے لئے آیا کرتا۔ کھاتو کہتی تھی۔ نانتھا چوری چکاری کرتا ہے اور جیل جانے کے ڈر سے گھر میں نہیں ٹکتا۔ لالی سب سے چھوٹی تھی اور ماں کی لاڈلی۔ جب سے اُس کا قد بڑھنے لگا تھا۔ کھاتو سائے کی طرح اُس کے ساتھ رہتی اور کبھی اپنے سے الگ نہ کرتی۔

کراچی پہنچکر لالی اپنی ماں کے ساتھ چپک گئی۔ اسے یُوں محسوس ہوا جیسے اناج جمع کرنے والے گنبد میں بند کر دی گئی ہو۔ چاروں طرف دیواریں ہی دیواریں تھیں۔ رشتے دار عورتوں کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ کھاتو کراچی میں کافی دنوں کے لئے آئی ہے اور اُن میں سے ایک عورت اُسے صبح کسی بنگلے میں کام دلوانے لے جائے گی۔ وہ سب اتنے غریب تھے کہ کسی مہمان کو بٹھا کر کھلانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن لالی کی سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا تھا کہ کھاتو اتنی جلدی میں اُسے گاؤں سے کیوں لے آئی۔ وہ بات کرتے کرتے ایک دم رونے کیوں لگتی ہے؟ بکریاں کس کے حوالے کر کے آئی ہے؟ اس پورے ہنگامے میں کھاتو نے کوئی ڈھنگ کی بات لالی سے نہیں کی تھی۔ گیارہ برس کی لالی حیرت سے سب باتیں سُنتی اور ماں سے چمٹ جاتی۔

دوسری صبح روٹی کے ساتھ گرم چائے پیتے ہوئے لالی کو اپنے حلق کا سوراخ بہت بڑھتا ہوا لگا۔ اُسے کبھی چائے پینے کو نہیں ملی تھی۔ نانا تھا چائے کی پتّی لاتا تو کھاتو بڑے اہتمام سے چائے بناتی مگر لالی دُور بیٹھی دیگچی میں سے گرم گرم بھاپ نکلتی دیکھا کرتی اور چھاچھ کے ساتھ روٹی کے نوالے نگلتی جاتی۔

سڑک پر ابھی اتنی رونق نہیں ہوئی تھی جب وہ کام کے لئے باہر نکلیں۔ لیکن لالی کا ڈر کے مارے بُرا حال تھا۔ اُسے ہر گاڑی اپنے اُوپر چڑھتی محسوس ہوتی۔ وہ سڑک کے دوسری طرف شاید کبھی نہ پہنچتی اگر رشتے دار عورت ہاتھ پکڑ کر اسے نہ گھسیٹتی۔

بنگلے میں کام زیادہ نہیں تھا۔ دو میاں بیوی اور دو بچّے۔ لالی بچّوں کی چیزیں للچائی نظروں سے دیکھنے لگی تو گھر کی مالکن نے اُسے ربر کی ایک نیلی گیند تھما دی اور باہر جا کر کھیلنے کی تاکید کی۔ کھاتو بھی شہر میں اجنبی تھی زبان بھی اس کے لئے نئی تھی۔ وہ اور بیگم صاحب گھنٹوں ایک دوسرے کو اپنا مطلب سمجھایا کرتیں مگر کھاتو کے کام سے سب خوش تھے۔ کھاتو نے زندگی میں پہلی مرتبہ اتنا سجا سجایا بھرا پورا گھر دیکھا تھا۔ ہر چیز پہ اس کی نیت خراب ہوتے لگتی مگر کام دلانے والی رشتہ دار عورت کے ڈر سے وہ اپنے آپ پر قابو پا لیتی۔ البتہ چائے کے چمچ، نیپکن، صابن کی ٹکیاں، ماچس کی

ڈبیاں اور ایسی چھوٹی موٹی چیزیں کرُتے کی لمبی سی جیب میں گاہے گاہے ڈال لیا کرتی۔ بیگم سے اپنی بدنصیبی کا رونا روتی تو وہ ترس کھا کر اُسے کچھ نہ کچھ دے دیتیں۔ یہ تمام چیزیں کھا تُو احتیاط سے جمع کر رہی تھی۔ کسی دن گاؤں لے جانے کے لئے۔

لالی دروازے کے باہر سیڑھیوں میں گیند کو اُوپر نیچے اچھالا کرتی یا ماں سے جلدی کام ختم کر کے واپس چلنے کی ضد کرتی۔ اُسے کسی کی بات ہی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ کوئی اُس سے کچھ کہتا تو وہ گھبرا کر اپنے ہاتھ دبانے لگتی۔ اسے گاؤں یاد آنے لگا تھا۔ جہاں وہ آزادی سے بھاگ سکتی تھی، موٹروں کے خوف سے بے نیاز ہو کر گھوم پھر سکتی تھی۔ گنا دانتوں سے چھیل کر چوسنے کا مزہ اُسے بار بار گھر کی یاد دلا دیتا۔ لالی جب بھی ماں سے واپس چلنے کی بات کرتی وہ اُسے جھڑک دیتی جیسے گھر میں اُس کا کوئی دشمن بیٹھا ہے۔ جو فوراً انہیں چیر پھاڑ کر کھا جائے گا۔ ایک دن سڑک پار کرتے ہوئے لالی موٹر کے سامنے آ گئی اور بال بال بچی تب کھا تُو اسے گھر چھوڑ آئی اور اُس دن سے لالی ماں کے ساتھ کوٹھی پر جانے سے بچ گئی۔ اب وہ محلّے کی گندی گلیوں اور سڑاند بھری نالیوں کے پاس سارا دن دوسرے بچّوں کے ساتھ کھیلا کرتی۔

ایک روز وہ گلی میں لنگڑی ٹانگ کھیل رہی تھی کہ دُور سے اسے

باپ آتا ہوا دکھائی دیا۔ لالی کھیل بھول کر حیرت سے باپ کو دیکھنے لگی۔ پھر اسے ڈر لگنے لگا۔ اس نے باپ سے کبھی زیادہ بات چیت نہیں کی تھی کسی خطرے کو محسوس کر کے اس نے سوچا کہ کہیں چھپ جائے اور ماں کی واپسی کا انتظار کرے مگر دیر ہو چکی تھی۔ ناتھا اُس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اور غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لالی سر جُھکا کر کھڑی ہو گئی۔ ناتھے نے جیب سے مٹھائی نکال کر لالی کو دی۔ لالی مٹھائی لے کر آہستہ آہستہ کھانے لگی۔ اس کا خوف دُور ہو گیا اور باپ کو کراچی آنے کی پوری تفصیل بتا دی۔

"میں تجھے گاؤں لے چلوں گا۔ یہاں تُو بیمار ہو جائے گی"۔ ناتھے نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ماں آ جائے پھر چلیں گے نا؟" لالی نے خوشی خوشی پوچھا۔

"نہیں بس چھوٹ جائے گی"۔ ناتھا غصّے سے بولا۔ لالی سہم گئی۔ دو تین عورتیں جو گھروں میں تھیں باہر نکل آئیں اور لالی کو لے جانے سے منع کرنے لگیں مگر ناتھا اُسے لے کر چلا گیا۔

کھاتُو واپس آئی تو دکھ سے نڈھال ہو کر گر پڑی۔ اسے ناتھے کے شہر آنے کا ذرا بھی گمان نہیں تھا اور یہ تو اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ سب کچھ اتنی جلدی اور خاموشی سے ہو جائے گا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ناتھا آیا بھی تو میں شور کروں گی، روؤں گی۔ وہ مار مار کر جان بھی نکال دے گا پھر بھی چُپ

نہیں رہوں گی۔ ڈھائی دوں گی مگر اس کا تو غم اور غصّہ بھی اندر ہی اندر گھُٹ کر رہ گیا۔ لالی کو وہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنے سے جدا نہ کرتی تھی۔

"لالی میری بچّی ــــــــ" اسے رات کاٹنی محال ہو گئی۔ سویرے ہی وہ بنگلے والوں سے تین دن میں واپس آنے کا وعدہ کر کے اور اپنے پیسے لے کر گاؤں جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

کپاس کی تیسری چُنائی بھی ہو چکی تھی۔ اور اب خالی ڈنٹھلوں میں بکریاں اور گائیں مُنہ مار کر بنولے ڈھونڈ رہی تھیں۔ گیہوں کی فصل دُور دُور تک لہلہا رہی تھی۔

"لگتا ہے اب کے گیہوں جلدی تیار ہو جائے گا" کھاتو کے کسان ذہن نے سوچا۔ ہوا میں گرمی آ گئی تھی۔ اسے اپنی پیٹھ اور گردن پر دُھوپ کی تیزی محسوس ہوئی اور وہ سرسوں کے کھیت کے کنارے بیٹھ گئی۔ سرسوں کی تیکھی مہک دُور دُور تک پھیلی تھی۔ کئی دن سے لالی بھی سرسوں کے رنگ کا شلوار کرتا پہنے تھی۔ کھاتو کو لالی کی یاد پھر ستانے لگی۔ اُس نے غصّے اور بے بسی میں بہت سے پودے نوچ ڈالے اور پتیّوں کو ہاتھوں میں مسلتی ہوئی پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

جب سے لالی بڑی ہو رہی تھی کھاتو کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اُسے کس طرح ناتھے سے چھپا کر رکھے۔ دوسری دو لڑکیوں کے تو اُونے پونے دام

لگے تھے تب وہ انہیں ایک وقت کی روٹی مشکل سے کھلا پاتی تھی اور جلد
چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی مگر اب لالی اکیلی رہ گئی تھی۔ کھاتو اسے اچھا بھلا
کھلا سکتی تھی۔ لالی اپنی بہنوں میں سب سے خوبصورت نکلی تھی۔ تیکھے نقوش، گندمی
رنگت اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں ابھی سے بہت روشن تھیں۔ کھاتو چاہتی تھی کہ
تھوڑا وقت اور نکال کر لالی کا ہاتھ کسی اچھے آدمی کے ہاتھ میں دے دے اور جو دام
ملیں ان کی گائے خرید لے۔ لالی کو وہ اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتی تھی اور اسی لئے
پوری تندہی سے اس کی دیکھ بھال کیا کرتی مگر ناتھے کی بدنیتی کا اسے شروع سے
اندیشہ تھا۔ وہ کھاتو کو اپنے لئے بے کار محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنے
دوست فیجی کی لڑکی کو دیکھا تو رال ٹپک پڑی مگر فیجی نے بدلے میں لالی کا مطالبہ
کر دیا۔ کھاتو کو جب ناتھے کے منصوبے کا پتہ چلا تو وہ لالی کو لے کر بھاگم بھاگ
شہر پہنچ گئی مگر ذرا سی چوک ہو گئی اور اب لالی اس کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔
اسے معلوم تھا کہ اب تک ناتھے نے لالی کو فیجی کے گھر پہنچا دیا ہو گا اور فیجی کی
بیٹی کو جو لالی کی ہم عمر اور سہیلی تھی اپنے گھر لے آیا ہو گا۔ کھاتو کی سوتن بھی تو اس
کی بیٹی کی طرح دبلی پتلی اور شوخ تھی۔ کھاتو کو پھر رونا آ گیا۔ لالی کتنی چھوٹی سی ہے
نہ جانے اس حرامی فیجی نے اسے کس حال میں رکھا ہو گا۔

شروع شروع میں جب یہ بات پھیلی تو گاؤں کی عورتوں کو کھاتو کا ردِّ عمل
بہت عجیب لگا۔ یہ تو ہمیشہ سے ہوتا آیا تھا۔ ایسی کیا انوکھی بات تھی جو کھاتو نے

آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا۔ خود کھاتُو بھی تو ناتھے کی بہن کے بدلے میں آئی تھی۔
کھاتُو کے باپ نے ناتھے کی بہن سے بیاہ کر کے اپنی بیٹی کو ناتھے کے حوالے
کیا تھا۔ وہ بھی تو چھوٹی سی تھی۔ اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ پہلا سر اُس نے ناتھے
کے گھر میں آکر دھویا تھا اور اُس کی اپنی ماں نے سَوت آنے پر کوئی ہنگامہ نہیں
کیا تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ کھیتوں میں کام کرنے جاتی تھیں۔ جب ناتھے کی بہن
کا پہلا بیٹا یعنی کھاتو کا سوتیلا بھائی پیدا ہوا تو سب کچھ کھاتو کی ماں نے کیا تھا۔
اور ایک مہینے تک بچے کو اپنے ساتھ لے کر سوئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ کھاتُو کے
باپ نے اسے جنگل لے جا کر کلہاڑی سے مار تو نہیں ڈالا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا
تو کون دیکھنے اور روکنے والا تھا مگر لالی ———— اس کی بچی! کھاتُو تو اسے
زمیندار کے کارندوں سے بھی بچاتی تھی۔ جب سے لالی بڑی ہو رہی تھی کھاتُو
کو ہر مرد اپنا دشمن معلوم ہوتا۔ اتنی الہڑ اور بھولی بھالی ——— نہ جانے کس
حال میں ہوگی۔ اُس کے ہاتھ سے لالی کیا گئی تھی جیسے پورا مستقبل ہی پھسل
کر کہیں گُم ہو گیا تھا۔

کھاتُو بہت دیر تک کھیت کے کنارے بیٹھی رہی۔ کسی نے اُسے
پودوں کے پیچھے سے نہیں دیکھا۔ جب اندھیرا بڑھنے لگا تو وہ اٹھی اور
مرے مرے قدموں سے گھر کی طرف چلنے لگی۔ اب گھر جاتے ہوئے اسے ڈر
لگ رہا تھا کہ ناتھا اسے دیکھ کر بگڑ جائے گا۔ وہ جھگڑا کرے گی تو اُسے جنگل

لے جا کر کلہاڑی سے مار نہ ڈالے۔ گھر کے قریب پہنچتے پہنچتے تو وہ بہت ہی
خوف زدہ ہو چکی تھی۔ اس کے پیر کانپ رہے تھے۔

گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر اس نے پھونس
کا دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ دھند لکے میں ہر چیز اُجڑی ہوئی دکھائی
دیتی تھی۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ چولہے پر ہانڈی رکھی تھی مگر چولہا ٹھنڈا
تھا۔ اس نے ہولے سے آواز دی پھر ڈرتے ڈرتے چلّا کر اپنی موجودگی کا
اظہار کیا تو پڑوس سے کوئی بھاگ کر اُس کے قریب آگیا۔

"ناتھے کو پولیس لے گئی" کسی نے اُسے پہچان کر کہا۔ اب تک پڑوس
کی عورت نے دیا جلا دیا تھا اور پھیکی روشنی میں کھاتو کی اُجاڑ صورت دیکھ
رہی تھی۔

"دوسرے گاؤں میں ڈاکہ پڑا تھا۔ پولیس ناتھے کو بھی پکڑ لے گئی۔
آج سویرے ہی تو پکڑا گیا ہے"۔

"اور لالی؟" کھاتو کو کچھ آس بندھی۔

"فیجی کے گھر میں ہے"۔ کھاتو کی ساری تکان ایک دم اُس پر طاری
ہو گئی۔ وہ کچے فرش پر بیٹھ گئی۔

"اور ناتھے کی عورت؟" ذرا دم لے کر اس نے جھجھکتے ہوئے
پوچھا۔ اپنی بیٹی کی ہم عمر گیارہ برس کی بچّی کو ناتھے جیسے مُوچھڑ مرد کی عورت

کہتے ہوئے اُسے عجیب لگا۔

"وہ اپنے باپ کے ہی گھر میں ہو گی" ــــــ کسی نے جواب دیا۔ انہوں نے کھاتُو سے کھانا کھانے کے لئے کہا تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"پہلے لالی کو دیکھ کر آؤں پھر کھاؤں گی"۔ وہ باہر جاتے ہوئے بولی۔ اُس کا ذہن تیزی سے نیا منصوبہ بنا رہا تھا۔

"لالی کو لے کر رات کو ہی کراچی چلی جاؤں گی۔ ناتھا تو اب جیل میں سڑے گا۔ لالی کے لئے کوئی اچھا بر مل جائے گا۔ جو پیسے بھی اچھے دے سکے۔ لالی جیسی لڑکی کے لئے پیسے والے آدمی کا ملنا مشکل نہیں"۔ وہ سوچتے سوچتے نبجی کے گھر پہنچ گئی۔ اندر ہلکی سی روشنی ہو رہی تھی۔ کوئی کتا اسے دیکھ کر زور سے بھونکا مگر کھاتُو کی دُھتکار سن کر چپ ہو گیا۔ کھاتو آنگن میں جا کر کھڑی ہو گئی اور بیٹی کی سسرال دیکھنے لگی جو کسی بھی طرح اُس کے اپنے گھر سے مختلف نہ تھی۔ مٹی کی کچی دیواریں، اوپر گھاس پھونس کا چھپر، کونے میں بندھی ہوئی بکری، چھینکے میں لٹکی مٹی کی ہانڈی اور اندر ایک کھاٹ، سامنے چولہے کے پاس لالی بیٹھی ہوئی کچھ پکا رہی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی سی لگتی تھی۔ روشنی میں اُس کا آدھا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کھاتو کو اپنی بیٹی بہت بدلی ہوئی لگی۔ الھڑپن کے ساتھ ساتھ عجیب سی بے چارگی محسوس ہو رہی تھی اُسے دیکھ کر۔ ماں کو یوں اچانک اتنے قریب دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ پھر بھاگ کر اُس سے لپٹ گئی۔ کھاتُو

بیٹی کو لپٹائے دیر تک روتی رہی۔ اس نے لالی سے فیجی کے بارے میں ایک بات بھی نہیں کی۔

"تیرا باپ تو جیل میں ہے۔ میں تجھے یہاں سے لے جاؤں گی۔" اس نے محبت سے لالی کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ لالی چپ رہی۔

"ہم کراچی چلے جائیں گے ابھی ابھی۔" اُس نے لالی کو غور سے دیکھ کر کہا۔

"فیجی نے تیرے دام تو نہیں دیئے ہیں۔ اُس کی بیٹی اس کے پاس ہے جسے چاہے دے اور جسے چاہے اس کے بدلے میں اپنے گھر ڈال لے۔ ہمیں کوئی مطلب نہیں۔ ناتھا تو نہ جانے کب تک جیل میں سڑے گا۔" کھاتو کو محسوس ہو رہا تھا کہ ناتھے کے پکڑے جانے سے اُس کے بھاگ کھل گئے ہیں۔

لالی بیٹھی ہانڈی میں ڈوئی ہلاتی رہی۔

"اٹھ بیٹی دیر نہ کر" —— کھاتو نے پیار سے کہا۔

"نہیں ماں،" لالی نے آہستہ سے انکار کیا۔

"شہر سے ڈرتی ہے؟ —— اب تجھے سڑک پر نہیں لے جاؤں گی۔ پھر تو چلنا بھی تو سیکھ جائے گی نا! روز روز تھوڑے کوئی موٹر کے سامنے آتا ہے۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" لالی نے ماں سے کہا۔

"میں تجھے یہاں نہیں چھوڑوں گی۔ چل کھڑی ہو جا۔ یہاں دیر تک نہیں رکنا چاہیئے" کھاتُو اب بے چین ہو رہی تھی۔

"فبجی آجائے گا ——" لالی نے ڈرتے ڈرتے بند دروازے کی طرف دیکھا جیسے دروازہ کھلتے ہی کوئی اس پر حملہ کر دے گا۔

"ہم اس سے پہلے نکل جائیں گے۔ وہ تیرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟ اس کی بیٹی نا تجھے کے پاس تو نہیں ہے۔ وہ پھر سے جسے چاہے گھر میں رکھ لے ——" کھاتُو آج پہلی مرتبہ لالی سے اس طرح کی باتیں کر رہی تھی۔

"نہیں ماں، فبجی کہتا ہے گھر سے باہر نکلی یا کسی سے بات بھی کی تو جنگل لے جا کر کلہاڑی سے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ میں نے وہ کلہاڑی بھی دیکھی ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی —— کہیں نہیں۔ وہ مجھے ڈھونڈ نکالے گا اور پھر مار ڈالے گا۔ ماں تو جا یہاں سے ——" لالی گھٹی گھٹی خوف زدہ آواز میں بول رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا لیا اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ کلہاڑی —— پہلے کھاتُو کی ماں اور پھر کھاتُو کے سر پر ساری عمر لہراتی رہی اور آج اس کی بیٹی لالی کی چوکھٹ میں اس کے خون کی پیاسی بنی بیٹھی تھی۔ کھاتُو نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا اور زمین پر ڈھیر ہو گئی۔

◎

آخری منزل

کراچی میں پچھلے دنوں چھت کی بھرائی کے دوران
ایک زیرِ تعمیر عمارت گر پڑی۔
کام کرنے والے پانچ مزدور ملبے میں دب کر ہلاک
ہو گئے۔
ایک اٹھارہ سالہ مزدور کی موت کے سرٹیفکیٹ
کو یوں بھرا گیا۔
نام ؟
نامعلوم !
ولد ؟
نامعلوم !
سکونت ؟
نامعلوم !

"یہ رکھ لو تمہارے کام آئیں گے"۔ کلثوم نے آنچل میں بندھی گرہ سے

مُڑے تڑے، ڈیڑھ سو روپے کے نوٹ کھول کر اسلم کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

"نہیں ماں!"——— وہ ماں کہتے ہوئے کچھ جھجکا پھر بڑے دکھ سے بولا "نہیں تم انہیں اپنے پاس رکھو۔ آخر تمہارے پاس بھی کیا ہے؟"

کلثوم نے پھونس کی گارے سے لپی ہوئی چھت اور مٹی کی دیواروں کو دیکھا، گلیارے میں بندھے چند جانور اور آنگن میں ٹوکرے کے نیچے بند مرغیوں کی کٹر کٹر سنی اور ہولے سے بولی۔

"یہ سب تو ہے" پھر اس نے اسلم کی مٹھی میں روپے رکھ کر اُسے اپنے ہاتھ سے بند کر دیا۔

"کراچی تمہارے لئے اجنبی جگہ ہے"——— وہ رک رک کر بڑی شرمندگی سے کہہ رہی تھی "تمہارے چچا زاد بھائی وہاں کئی سال سے———"

"بس کرو ماں!"——— اسلم نے ناگواری سے بھنوئیں چڑھائیں اور پھونس کا تنکا منہ میں دبائے دروازے کے باہر دیکھنے لگا۔ وہ دن پہلے تک جو رشتے اتنے فطری اور انمٹ لگتے تھے ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو چکے تھے۔ صرف رشتے ہی تو تھے۔ محبتیں تو نہیں تھیں کہ ٹوٹ کر بھی جُڑی رہتیں۔

گاؤں میں بڑی عمر کے سب ہی لوگ جانتے تھے کہ اسلم، صدیق اور کلثوم کا اپنا بیٹا نہیں ہے۔ وہ لوگ ایک مرتبہ گاؤں سے کراچی کسی رشتے دار کی شادی میں گئے تھے۔ آنے سے ایک روز پہلے بازار میں گھومتے ہوئے انہیں

ایک ڈیڑھ دو سال کا گول مٹول۔ گورا چٹا، بچہ ملا تھا بچہ بلک بلک کر رو رہا تھا، اس کے گلابی گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں کلثوم کے دل میں ممتا کی دھار بن کر اتر گئیں۔ اُس نے لپک کر بچے کو گود میں اٹھا لیا اور چادر سے اُس کے آنسو پونچھتے ہوئے چمکارنے لگی۔

"ارے کیا کرتی ہے؟ ــــ کسی کا بچہ یوں اٹھا لیا" ــــ صدیق نے گھبرا کر کہا۔

"جس ناقدرے کا بچہ ہے وہ اُسے یوں چھوڑ کر کیوں گیا؟"

شادی کو کئی سال ہو چکے تھے مگر کلثوم کی گود خالی تھی۔ بچہ کپڑوں اور حلیئے سے کسی اچھے خاندان کا معلوم ہوتا تھا۔

"پکڑے گئے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ محبت میں تم نے اس بچہ کو اٹھا لیا تھا" صدیق نے سمجھانے کی کوشش کی۔

مگر کلثوم کا ایک ہی جواب تھا۔ "ایسے ویسے لوگوں کے ہاتھ پڑ گیا تو کیا وہ اس پھول سے بچے کو بیچ نہ دیں گے؟ یوں روتے روتے بھوک پیاس سے مر نہیں جائے گا؟"

صدیق بے بس ہو گیا۔ گاؤں پہنچ کر انہوں نے بستی والوں اور رشتے داروں کو بتایا کہ ایک بچے کو گود لے لیا ہے۔ سب نے مبارکباد دی۔ اُن کے بے اولادے پن کا علاج کسی دوا، دعا، تعویز اور منت سے ممکن نظر

نہیں آتا تھا۔

دھوم دھام سے بچّے کا عقیقہ کیا گیا۔ کلثوم اب اپنے آپ کو کسی دوسری عورت سے کم نہ سمجھتی تھی۔ بچّہ اتنا پیار اور اتنی محبت پاکر دو چار روز میں ہی اپنے ماں باپ کو بھول گیا۔ اُس کی ہر خواہش پوری ہو جاتی۔ کھیل کود، شرارتوں اور چھچھورپن کسی پر روک ٹوک نہیں تھی۔ اس میں اتنے لاڈ پیار کے سبب بڑا اعتماد اور خود سری پیدا ہو گئی تھی۔ ہمجولی، اُس کے اکلوتے پن پر رشک کرتے تھے۔ اسلم کے ہم عمر بچوں کو نہیں معلوم تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کی اصلی اولاد نہیں ہے۔ گاؤں والے اس کا تذکرہ بھی کسی سے نہیں کرتے تھے۔ پھر جس طرح وہ پل بڑھ رہا تھا تو سب بھول گئے تھے کہ وہ کلثوم اور صدیق کی سگی اولاد نہیں ہے۔

"اپنی خیریت ضرور لکھنا" —— ماں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

اسلم سر جھکائے انگوٹھے سے کچے فرش پر نشان بناتا رہا۔ پانچ سال تک وہ گاؤں کے اسکول میں جاتا رہا تھا۔ چٹائی کے فرش پر مل مل کر بیزار اور چڑچڑے ماسٹر صاحب کے سامنے سبق یاد کرتا اور کچھ ٹوٹا پھوٹا لکھ بھی لیتا تھا — ایک روز سویرے اٹھ کر اُس نے اسکول جانے سے انکار کر دیا اور باپ کے ساتھ کھیتوں پر چلا گیا۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ جوان ہو رہا تھا اور صدیق کو اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ زمین زیادہ نہیں تھی

مگر اسلم کی جواں سال محنت اور لگن کے سبب مکئی اور گنے کی فصلیں بہت عمدہ ہوئیں۔

کچھ دنوں سے صدیق کا سانس بہت پھولنے لگا تھا۔ مگر بارش کے ڈر سے فصل کا کاٹنا بہت ضروری تھا۔ یہ کام اکیلے اسلم کے بس کا نہیں تھا۔ ایک دن تیز دھوپ میں کام کرتے کرتے صدیق گر پڑا اور پھر نہیں اٹھا۔

اندر ہی اندر کیا کھچڑی پک رہی تھی اسلم سب سے بے خبر اپنے کھیت میں جُتا ہوا تھا۔ باپ کی موت کے بعد اسے ایک ہی دھن تھی کیسی طرح اچھی سے اچھی فصل تیار کرے اور باپ کی روح کو خوش کرے ــــ مگر کوئی قانونی اور کاغذی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا صدیق کے دونوں بھائی اس کی زمین کے وارث اور مالک تھے۔ کلثوم نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے اُسے دھمکایا۔

"ہم عدالت میں سب کے سامنے بیان دیں گے کہ اسلم، صدیق کا کھیت مزدور تھا۔"

بے چاری عورت سناٹے میں آگئی۔

اسلم پسینے میں نہایا سورج ڈوبنے سے ذرا پہلے گھر آیا تو بہت خوش تھا۔ آج محنت کر کے اُس نے پورے کھیت میں ہل چلا لیا تھا۔ پسینہ پونچھ

کر وہ ماں کے قریب بیٹھ گیا اور اُس کے غمزدہ چہرے کو دیکھ کر اداس ہو گیا۔

"تو اتنی محنت کیوں کرتا ہے؟" کلثوم نے محبت سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

"اب میرے سوا کون ہے ان کھیتوں کی دیکھ بھال کرنے والا۔ ماں مجھے محنت تو کرنی چاہیئے نا۔"

کلثوم اس کی مضبوط پیٹھ، سڈول کسے ہوئے ہاتھ پاؤں، اونچے قد پر تنی ہوئی گردن لمبوترے چہرے اور سیاہ گھنے بالوں کو دیکھتی رہی۔ تھکی تھکی سی اُسے کھانا کھلاتی رہی اور اُس کی کھلی بھوک کو دل ہی دل میں دعائیں دیتی رہی۔ وہ بہت بے چین تھی۔ اسلم کھیتوں کے مالک سے ایک دم کھیت مزدور بن گیا تھا۔ یہ سوچ کر اُس کا دل بھنچنے لگا۔ اس نے سوچا آج نہیں تو کل اسلم کو حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ کیوں نا میں خود اسے ابھی سب کچھ بتا دوں۔ اُس نے رک رک کر اسلم کو پوری داستان سنا دی۔

رات بہت ہو گئی تھی۔ اسلم کے جسم میں خون ٹھہر سا گیا۔

"تم لوگوں نے میرے ماں باپ کو کیوں نہیں ڈھونڈا؟ ——— تھانے میں کیوں نہیں لے گئے؟"

"ہم کئی گھنٹے وہاں کھڑے رہے کہ شاید تمھیں کوئی ڈھونڈتا ہوا آ جائے مگر کوئی نہیں آیا۔ تھانے اور پولیس سے تمہارا باپ ہمیشہ بہت ڈرتا تھا۔ پھر میری حالت دیکھ کر وہ کچھ بے بس ہو گیا۔" کلثوم نے سب کچھ سچ سچ کہہ دیا اور لالٹین کی دھیمی روشنی میں اسلم کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جو بیزاری اور غصے میں کچھ بگڑ گیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ شوہر کی موت پر شاید وہ اس دکھ سے نہیں روئی تھی۔ آخر اسلم نے اُسے گلے لگا لیا۔

"اب میں کہاں جاؤں ؟"

"تمہارے چچا" —— اُس کے منہ سے نکل گیا۔ پھر وہ سنبھل کر بولی۔

"یہ لوگ تمہیں کچھ نہیں دیں گے۔ مجھے ذرا بھی آسرا ہوتا تو تمہیں یہ سب نہ بتاتی۔ وہ تم سے اچھا سلوک نہیں کریں گے۔"

"تب میں کراچی جاؤں گا۔ کیا خبر مجھے اپنا گھر مل جائے۔" اسلم چارپائی پر سیدھا لیٹ کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "میں کل صبح ہی چلا جاؤں گا۔"

دوسرے دن سویرے ابھی سورج بھی نہیں نکلا تھا۔ جب اسلم اپنے گاؤں سے دو میل دور پہنچ چکا تھا۔ اب وہ وہاں ایک منٹ کے لئے نہیں ٹک سکتا تھا۔ اس کے سر پر دری کا بستر، ایک ٹین کا بکس اور پوٹلی

میں کھانے پینے کا کچھ سامان تھا جو کلثوم نے روتے روتے اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ سے کراچی دیکھنے کی فرمائش کرتا مگر اب وہ یوں چل رہا تھا جیسے کوئی لمبی سزا کاٹنے جا رہا ہو۔ ریل گاڑی کے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں وہ چپ چاپ نظریں نیچی کئے بیٹھا رہا۔ اس کے دل میں ڈر خوف یا اندیشہ کچھ نہیں تھا۔ ہاں لیکن خاتمے کا احساس تھا۔ محبت، آزادی اور خوشیوں کے خاتمے کا۔ البتہ زندگی ساتھ چل رہی تھی۔ دھک دھک کرتی اس ریل گاڑی کی طرح جس میں سکڑا، سمٹا وہ اپنے گاؤں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

دن ڈھلنے لگا جب گاڑی کراچی کی حدود میں داخل ہوئی کینٹ اسٹیشن پہ بہت سے مسافر اترنے لگے۔

"کیا آگے کوئی اسٹیشن آتا ہے؟" اس نے پورے سفر میں پہلی مرتبہ پاس بیٹھے مسافر سے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔

"ہاں آتا ہے۔ گاڑی سٹی اسٹیشن پر رکے گی۔ وہ آخری اسٹاپ ہے" ـــــ مسافر نے جواب دیا۔

اسلم پلیٹ فارم سے باہر آنے لگا تو دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے ایک آدمی سے ٹکرا گیا۔

"مارو مارو، غریب کو سب مارتے ہیں" ـــــ وہ آدمی بڑبڑایا۔

"معاف کرنا بھائی دکھائی نہیں دیا" —— اسلم بوکھلا گیا اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

اُسے شدید پیاس لگ رہی تھی۔ اسٹیشن کے احاطے میں لگے نلکے سے منہ لگا کر اُس نے پانی پیا اور قریب ہی بیٹھ کر پوٹلی کھولی اور کھانا کھانے لگا۔

"کہاں جاؤں ؟" —— وہ بار بار اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ اگر صدیق یوں اچانک نہ مرتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

"کاش یہ سب نہ ہوتا" —— اُس کا جی چاہا گاؤں واپس چلا جائے۔ مگر دوسرے لمحے پتھر کا ایک گولہ سا سارے جسم میں گھوم گیا۔

سڑک پر پہنچ کر وہ چاروں طرف دیکھنے لگا۔ بھیڑ نہیں تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا۔ دونوں طرف آفسوں، بینکوں، اسٹاک ایکسچینج اور انشورنس کمپنیوں کی اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ ہر عمارت کے قریب پہنچ کر وہ پہلے سے زیادہ پریشان ہو جاتا۔ اُسے وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ اُس نے سر اٹھایا یہاں آسمان بہت اونچا، بہت دور تھا۔ ان اونچی اونچی عمارتوں سے بھی اوپر۔ ستارے جنہیں وہ گاؤں میں خوب پہچانتا تھا یہاں نظر نہیں آئے۔ وہ پھر سڑک کی بتیوں اور عمارتوں کی روشن کھڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ آخر ایک دیوار کے نیچے اُس نے اپنا بستر بچھایا اور لیٹ گیا۔

"میرا گھر کہاں ہوگا؟ مجھے کون پہچانے گا؟ میں وہاں کیسے پہنچوں گا؟" ——— وہ دیر تک آنکھیں بند کئے سوچتا رہا۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ کراچی میں چور اچکے بہت ہوتے ہیں۔ وہ مضبوطی سے ایک ہاتھ بکس پر اور دوسرا اپنی جیب پر رکھے کروٹ لیتا رہا معلوم نہیں کب اُس کی آنکھ لگ گئی ——— وہ گاؤں میں اپنے ماں باپ کے ساتھ میلے میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ خوش خوش بیلوں کو گاڑی کے آگے جوڑ رہا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کوئی سخت نوکیلی چیز پیٹھ میں چبھ رہی ہے۔

"کیا ہے؟" ——— وہ چونک کر اٹھ بیٹھا۔

"تم یہاں نہیں سو سکتے" ——— رات کا چوکیدار اپنی لاٹھی کی نوک اس کی پیٹھ میں چبھو رہا تھا۔

"کہیں اور جاؤ" ——— وہ لاٹھی بجاتا آگے بڑھ گیا۔

اسلم نے اپنا بستر لپیٹا اور وہیں ایک طرف کو سمٹ کر بیٹھ گیا۔ چوکیدار کے ڈنڈے کی آواز قریب آجاتی تو وہ دیوار سے چپک کر اندھیرے کا حصّہ بن جاتا۔ اسی طرح چھپتے، چپکتے رات بیت گئی۔ جہاں جہاں آسمان نظر آرہا تھا وہاں صبح کی سفیدی پھیل رہی تھی ——— اُسے کچھ حیرت ہوئی نہ چڑیاں بولیں نہ جانور ڈکرائے، مرغ تک کی بانگ سنائی نہیں دی۔ فقط مسجدوں میں سے بیک وقت بہت سی اذانوں کی آواز آرہی تھی۔ دیواریں کھمبے سب

کچھ اسلم کو دن کے اجالے نیں اپنے اوپر گرتے محسوس ہونے لگے۔ اُس نے سامان سر پر رکھنے کے بجائے بغل میں دبایا اور ایک پتلی سی گلی میں مڑ گیا۔

بہت سے لوگ اسی کی طرح دیواروں کے ساتھ دوکانوں کے آگے تھڑوں پر اور سیڑھیوں پر سمٹے سمٹائے ابھی تک سو رہے تھے کچھ جاگ کر جماہیاں لے رہے تھے۔ اسلم کو ڈھارس بندھی۔ یہاں بہت سے لوگ میری طرح اپنا اپنا گھر ڈھونڈ رہے ہیں۔ اُس کا جی چاہا کسی سے بات کرے مگر ہمت نہیں پڑی۔ وہ دیکھ بھال کر چل رہا تھا۔ اب ٹریفک کافی بڑھ گیا تھا۔ آگے پیچھے بھاگتی موٹریں دھواں اگلتی بسیں، شور مچاتے رکشے، یہ سب دیکھ دیکھ کر وہ رک جاتا اور جھانک جھانک کر اُن سواریوں کے اندر دیکھنے کی کوشش کرتا جو ہوا کے جھونکے کی طرح زن سے گزرتیں تو وہ گھبرا کر پیچھے ہو جاتا۔

آہستہ آہستہ دھوپ پھیل گئی۔ وہ سامان اٹھائے ایک سڑک سے دوسری سڑک، ایک فٹ پاتھ سے دوسری فٹ پاتھ پر پھونک پھونک کر قدم رکھتا رہا۔ اُسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ پیسے بھی تھے۔ لوگ چھوٹی چھوٹی ہوٹلوں میں کھا پی رہے تھے۔ دودھ اور لسّی پی رہے تھے۔ ٹھیلوں پر سے پھل، چاٹ اور مسالے دار چیزیں خرید کر کھا رہے تھے مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح جا کر خریدے اور کیا کھائے۔ وہ بڑی دیر سے دیکھ رہا

تھا کہ ایک دوکان کے آگے فٹ پاتھ پہ بہت سے لوگ آ کر بیٹھتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں انہیں دوکان میں کام کرنے والے لڑکے پلیٹوں میں سالن اور روٹی دے کر چلے جاتے ہیں وہ کھاتے ہیں اور اٹھ جاتے ہیں۔ اُسے یوں کھانا کچھ آسان لگا اور ہمت کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اُسے پتہ نہیں چلا کہ اُس نے کیا کھایا اور کتنا۔ دوسرے بھی اسی کی طرح سر جھکائے کھانے میں منہمک تھے۔ وہ کھا پی کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ایک موٹا سا آدمی بہت بڑے چولہے کے سامنے کھڑا مسلسل پکار رہا تھا وہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

"پیٹ نہیں بھرا کیا؟" —— موٹے آدمی نے پوچھا۔

"نہیں بھر گیا کتنے پیسے ہوتے؟"

وہ آدمی بہت زور سے ہنسا اور اپنے قریب کھڑے دوسرے شخص سے بولا۔

"سنا تم نے خیرات کا کھا کر پوچھتا ہے کتنے پیسے ہوئے؟"

اسلم شرم سے سرخ ہو گیا۔ کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ بے عزتی کا خیال کولہو کے بیل کی طرح اس کے دماغ میں گھومے جا رہا تھا۔ وہ جب سے بڑا ہوا تھا کبھی بے کار نہیں بیٹھا تھا۔ کھیت میں کام نہ ہوتا تو دوسرا کام شروع کر دیتا۔ ایک کام کاجی آدمی کی خودداری اور اعتماد اس میں کوٹ

کوٹ کر بھرا تھا مگر یہاں کے طور طریقے، زبان اور رہن سہن سب کچھ
اتنا جدا تھا کہ وہ ایک ہی دن میں آسمان پہ چکر کھاتے پرندے کی طرح
ہلکان ہو گیا۔

اُسے گاؤں یاد آنے لگا۔ ماں کی شفقت! پھر تلخ سوچ کہ وہ میری
ماں نہیں ہے۔ ہر چھوٹے بڑے مکان کے سامنے کھڑا ہو کر وہ سوچتا۔ میرا
گھر یہی تو نہیں ہے؟ —— قریب سے گزرنے والے ہر بڑی عمر کے مرد کو دیکھ
کر سوچتا۔ "میرا باپ کیسا ہو گا؟" پھر دھکے، دھوئیں اور شور میں گھر کا
خیال اُس کے دل سے نکل جاتا۔

اچانک اُسے بھوری، سفید کھال کی چند گائیں اور بڑے بڑے
سینگوں والے بیل نظر آئے وہ انہیں بڑی اپنائیت سے دیکھنے لگا۔
جانوروں کے گلوں میں گھنٹیاں تو بندھی تھیں مگر یہاں شور میں اُن کی
آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ان کے پیچھے ایک آدمی موٹا سا ڈنڈا لئے چل
رہا تھا۔ ڈنڈا دیکھ کر اسلم کو رات کا چوکیدار یاد آ گیا۔ اُسے رات کا خیال
کر کے الجھن ہونے لگی۔ وہ خوفزدہ نہیں تھا مگر عجیب سی بے بسی اور
تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ سامنے ایک بہت بڑا لوہے کا پھاٹک تھا۔ سواریاں
آ جا رہی تھیں۔ لوگوں کو بھیڑ کی شکل میں آتے جاتے دیکھ کر وہ بھی اُن میں
شامل ہو گیا۔ ایک لمبے سے برآمدے میں جہاں کوڑا کرکٹ پھیلا تھا اور

پان کی پیکوں سے دیواریں لال ہو رہی تھیں بے شمار لوگ بیٹھے تھے۔ وہ بھی وہاں بیٹھ گیا۔ سب اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ کس لیے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

پھر اُسے ایک بڑے سے کمرے میں بلایا گیا۔ لمبی سی میز کے سرے پر ایک آدمی چشمہ لگائے ہاتھ میں کوئی آلہ لیے بیٹھا تھا۔ اسلم سامان بغل میں دبائے، گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا تو وہ آدمی اپنا آلہ میز پر بجاتے ہوئے اُسے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

"کیا شکایت ہے؟" ——— اسلم کچھ سمجھ رہا تھا کہ وہ کسی ڈاکٹر کے سامنے کھڑا ہے۔

"جی وہ میرا گھر ———"

"ذہنی مریض معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کیوں لائے؟" ڈاکٹر نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔ "اسے ڈاکٹر ضمیر کے پاس پہنچا دو۔"

اسسٹنٹ اسلم کا ہاتھ پکڑے تھوڑی دور آیا اور ایک برآمدے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"وہاں جا کر بیٹھو، وہ ڈاکٹر صاحب تمہیں دیکھیں گے۔"

اسلم پہلے تو کچھ دیر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ لاتعداد مرد۔ عورتیں، بچّے، بوڑھے، برآمدوں اور کمروں میں دروازوں تک ٹھنسے ہوئے

تھے۔ اُس نے کبھی اتنے بیمار لوگ نہیں دیکھے تھے۔ اُسے کسی نے نہیں بتایا تھا
کہ کراچی میں اتنے مریض رہتے ہیں۔ وہ کچھ رنجیدہ گھومتا رہا پھر باہر نکل گیا۔
سامنے کسی اسکول میں چھٹی ہوئی تھی۔ بچّے شور کرتے باہر نکل
رہے تھے۔ دروازے پر خوانچے اور ٹھیلے والے کھانے پینے کی چیزیں بیچ رہے
تھے۔ اسلم بڑے شوق سے یہ سب دیکھتا رہا۔ پھر چھوٹے بچوں کو ایک قلفی
والے سے قلفیاں خریدتے دیکھ کر اُس سے نہ رہا گیا اس نے بھی قلفی خریدلی
اور کھاتا ہوا پھر چلنے لگا۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ اتنے ڈھیروں لوگ ایک ہی
سمت میں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں مگر کوئی کسی سے بات نہیں کرتا۔ دیکھتا
بھی نہیں۔ آخر یہ سب کہاں جا رہے ہیں؟

اب وہ ایک پُل کی فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ پُل کی دیوار پر ایک لڑکا
ایک ڈولتی پتنگ کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اسلم رک کر اُسے شوق سے دیکھنے
لگا۔ اُس کا جی چاہا کہ میں بھی اسی طرح پُل کی دیوار پر بھاگوں۔ اُسی لمحے ایک
ریل گاڑی نیچے سے شور کرتی گزری۔ اسلم کو اپنا سفر یاد آگیا اور بے فکری
کا وہ چھوٹا سا لمحہ جو لڑکے کو پتنگ کے پیچھے بھاگتے دیکھ کر اُس کے اندر
لپکا تھا ریل کے دھوئیں میں کجلا گیا۔ وہ پُل اتر کر سامنے سیدھی سڑک
پر چلنے لگا۔

یہاں بھیڑ کچھ کم تھی۔ اُسے احساس ہوا کہ ہوا بھی خنک ہو گئی تھی

اور فضا میں عجیب سی بُو بسی ہوئی تھی۔ وہ ذرا آگے بڑھا تو پتھر کی ایک دیوار کے پیچھے بہت بڑا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سمندر کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا مگر اتنا پھیلا ہُوا پانی بہت دور دھواں دھواں سی فضا میں جہازوں کی قطار اور پانی پہ اڑنے والے پرندے سب کچھ نئے تھے۔ ایک مچھیرا زمین پر جال پھیلائے اس کی مرمت کر رہا تھا۔ اسلم اُسے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ وہ خود بھی اپنے بلوں کی اسی طرح کبھی کبھی دیکھ بھال کرتا تھا۔ دیوار پھلانگ کر اسلم مچھیرے کے قریب پہنچ گیا۔ اور پاس میں کھڑی اس کی کشتی کو ہاتھ سے چھونے لگا۔ مچھیرے نے جال پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے اُسے دیکھا۔

"کہاں جاتا ہے؟" —— اُس نے اسلم کے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں گھر ڈھونڈ رہا ہوں"

"کرائے کا؟"

"نہیں اپنا۔"

"زمین ہے؟"

"زمین —— " اسلم سوچ میں پڑ گیا۔

"زمین بھی نہیں ہے؟ پھر گھر کہاں بنائے گا؟ ایک کشتی لے لو

دن بھر اُس میں مچھلیاں پکڑنا، رات کو اسی میں سو جانا۔"

"مچھلیاں پکڑوں؟ یہ کام تو مَیں نے کبھی نہیں کیا۔"

"وہ سامنے دیکھو" —— مچھیرے نے ہاتھ لمبا کر کے اُس طرف اشارہ کیا جہاں سڑک بن رہی تھی اور بہت سے مزدور کام کر رہے تھے —— "وہاں تمہیں کام مل جائے گا۔"

پھر اُس نے اپنا جال لپیٹا اور کشتی کو دوڑا کر پانی میں دھکا دیتے ہوئے اُس میں چڑھ گیا۔ کافی دور جا کر اُس نے زور کا جھٹکا لگایا اور جال کو پھیلاتے ہوئے پانی میں پھینک دیا۔ اسلم منہ کھولے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنائے یہ سب دیکھتا رہا۔ بالکل اسی طرح وہ صدیق کے ساتھ مل کر کھیتوں میں بیج چھٹکاتا تھا۔ اگر یہاں نہ آتا تو چند دنوں میں بیج ڈالنا شروع کر دیتا۔

اسلم وہیں پر بیٹھ گیا اور مٹھی میں گیلی ریت بھر کر نیچے گرانے لگا۔ اسے کچھ افسوس ہوا کہ اس ریت میں کوئی چیز نہیں اُگ سکتی۔ وہ ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا اور سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُس سڑک کے کنارے پہنچ گیا۔ جہاں ایک روڈ رولر پتھروں پر چل رہا تھا۔ کالے کالے دھوئیں کے بیچ میں سے اینٹیں، پتھر ڈھوتے ہوئے مرد عورتیں، بڑے بڑے ڈرم اور کچھ فاصلے پر کھڑے ٹرک سب دھندلے اور جلے جلے دکھائی دیتے تھے۔

سڑک کے دوسری جانب اونچی اونچی عمارتیں بن رہی تھیں۔ اس

کے گاؤں میں چند پکّے مکان تھے وہ بھی زیادہ سے زیادہ دو منزلہ۔ وہ سر اونچا کئے مزدوروں کو بانس کی لکڑیوں پر چڑھتا، لکڑی کے ڈھانچوں میں اینٹیں اور مسالہ بھرتا دیکھتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں چبھن ہونے لگی۔ رولر چلنا بند ہوا تو وہ پتھروں پر پاؤں رکھتا سڑک کے دوسری طرف چلا گیا۔

زیرِ تعمیر عمارتوں اور گھروں کے قریب پندرہ بیس جھونپڑے تھے جن پر کپڑے، چیتھڑے اور پھٹی پرانی چٹائیاں پڑی تھیں۔ آس پاس کالے ننگ دھڑنگ بچّے اور کتّے کھیل رہے تھے، مٹی میں لوٹیں لگا رہے تھے۔

شام ہوگئی تو مزدور کام ختم کر کے ہاتھ منہ دھونے ایک بڑے سے حوض کے گرد اکٹھا ہونے لگے۔ پھر ان میں سے کچھ تو کپڑے پہن کر ٹولیوں میں وہاں سے چلے گئے اور جو اُن جھونپڑوں میں رہتے تھے وہیں رک گئے۔ عورتیں چولہے جلانے لگیں، بچوں کو دودھ پلانے لگیں۔ چیخ پکار، ڈانٹ ڈپٹ کتوں کا بھونکنا، بچوں کا رونا، مار کھانا سب ایک ساتھ شروع ہو گیا۔ پھر کھانے سے فارغ ہو کر بچّے سو گئے۔ مرد تمباکو پینے لگے، عورتیں دن بھر کے چھوڑے ہوئے کام ختم کر کے آنے والے کل کی تیاریاں کرنے لگیں۔ آہستہ آہستہ سناٹا اور اندھیرا چھا گیا کسی نے بلند آواز میں گانا شروع کر دیا۔ اسلم کی سمجھ میں بول نہیں آئے مگر جانی پہچانی وسعت کا احساس ہونے لگا۔

وہ اور اس کے دوست کھلیان کی رکھوالی کرتے ہوئے راتوں کو اسی طرح گیت گاتے تھے۔ پھر کسی نے بانسری پر ایک اداس دھن چھیڑ دی۔ اسلم کی آنکھوں کے کونوں میں آنسو جمع ہو گئے۔ کوئی چلتا ہوا اُس کے قریب آرہا تھا۔

"یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

اسلم خاموش رہا۔

"مسافر ہو؟"

اسلم نے گردن ہلا دی۔

"تو اندر آجاؤ۔ ابھی ٹھنڈ بڑھ جائے گی۔" آنے والے نے نرمی سے کہا۔ اسلم اندھیرے میں اُس کی شکل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ایک جھونپڑے پر پڑے پھٹے سے پردے کو اٹھا کر وہ اندر داخل ہو گئے۔ کونے میں رکھی لالٹین سے آدھے جھونپڑے میں روشنی ہو رہی تھی۔ تین بچے فرش پر سو رہے تھے۔ ایک جوان سی عورت ہاتھوں میں موٹے موٹے پلاسٹک کے کڑے پہنے لالٹین کے پاس بیٹھی کسی پرانے کپڑے کی مرمت کر رہی تھی۔ اُس نے ایک نظر آنے والوں کو دیکھا اور ہاتھ میں تھاما ہوا کپڑا نیچے رکھ دیا۔

"کچھ کھانے کو ہے؟" مرد نے پوچھا

عورت نے انکار میں گردن ہلا دی۔

"تو کچھ بنا دے یہ بے چارہ بہت بھوکا ہے"۔

عورت ایک لفظ کہے بغیر اٹھی اور کونے میں رکھے کنستر میں سے ایک تھالی کے اندر آٹا نکالنے لگی۔

"میں اپنا گھر اور اپنے ماں باپ کو ڈھونڈ رہا ہوں"۔

مرد کے کئی سوالوں کے جواب میں اُس نے مختصراً اپنے بارے میں بتایا۔ یہ سب دہرانا اسے عجیب لگ رہا تھا اور وہ بھی ایک اجنبی کے سامنے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اُس کا گھر کہاں ہے؟ ماں باپ کون ہیں؟ وہاں گاؤں میں جن کے ساتھ اُس نے زندگی گزاری یا یہاں شہر میں وہ لوگ جنہیں وہ جانتا پہچانتا بھی نہیں۔ بار بار اُس کے دل میں ہوک سی اٹھتی کہ واپس اپنی ماں کے پاس چلا جائے۔

"گاؤں واپس؟ ـــــ ماں کے پاس؟ ـــــ لیکن وہاں بھی تو کھیت مزدوری ہی کرنی پڑے گی"۔

"یہ لوگ تمہیں نوکر بنا لیں گے" ـــــ کلثوم کے الفاظ یاد کر کے بے عزتی اور محرومی کے احساس سے اُس کے کان جلنے لگے۔

"اتنے بڑے شہر میں تم اُن کا پتہ کس طرح لگاؤ گے؟ ہو سکتا ہے وہ تمہیں کبھی نہ ملیں" ـــــ مرد نے ہمدردی سے کہا۔

"ہاں ہو سکتا ہے" ــــــ اسلم سوچتے ہوئے بولا۔

"جب تک ہم لوگ یہاں ہیں تم ہمارے پاس رہ سکتے ہو۔"

"کیا تم ہمیشہ یہاں نہیں رہتے ؟"

"نہیں! ہم لوگ جہاں کام ہوتا ہے وہاں پڑاؤ کر لیتے ہیں۔ پھر جب کام ختم ہو جاتا ہے تو دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔"

اسلم کو یہ سب کچھ بہت انوکھا لگا۔ اُس کے ذہن میں تو ایک گھر ایک گاؤں اور اپنے کھیتوں کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا تصوّر نہیں تھا۔

پھر وہ بچوں کے قریب دری بچھا کر لیٹ گیا۔

سونے سے پہلے آدمی نے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے ؟"

"اسلم! اور تمہارا ؟"

"رانجھا۔"

"رانجھا!" ــــــ اسلم نے ذہن میں دہرایا اور سو گیا۔

دوسری صبح رانجھا، اسلم کو لے کر اوورسیئر کے پاس گیا اور پوری بات بتائی۔

"تم کسی تھانے میں جا کر رپورٹ لکھواؤ وہیں سے پتہ چلے گا۔"

اوورسیئر نے اُسے قریبی تھانے کا پتہ سمجھاتے ہوئے کہا۔

تھانہ زیادہ دور نہیں تھا۔ اسلم وہاں پہنچا تو ایک جیپ پھاٹک سے باہر نکل رہی تھی۔ اُس میں دو پولیس افسر سیاہ چشمے لگائے بیٹھے تھے۔

اسلم پھاٹک کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی کافی سویرا تھا۔ ایک سپاہی، ایک آدمی کی ہتھکڑی تھامے تھانے کے اندر چلا گیا۔ پھر ایک لڑکا بڑی سی ٹرے میں چائے اور ناشتے کا بہت سا سامان رکھے احاطے میں داخل ہُوا۔ اسلم ڈرتے ڈرتے اُس لڑکے کے پیچھے چل پڑا۔

برآمدے میں دو سپاہی بندوقیں لئے کھڑے تھے۔ دروازوں پر چقیں پڑی تھیں۔ یہ بہت بڑا احاطہ تھا اور عمارت بھی کافی پھیلی ہوئی تھی۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ چند اونچے اونچے پیڑ لگے تھے اور ایک طرف کی دیوار سے ملی ہوئی مسجد بنی تھی۔

"کون ہو تم ہے؟" ایک سپاہی نے ڈپٹ کر پوچھا۔

اسلم کانپ گیا۔ دوسرے بچوں کی طرح بچپن سے اُس کے دل میں بھی پولیس کا خوف بسا ہُوا تھا۔ اُس کا جی چاہا بھاگ کر مسجد میں چھپ جائے سر گھما کر اُس نے مسجد کے دروازے کو دیکھا جو تھانے کی دیوار میں کھلتا تھا مگر دروازہ بند تھا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" —— سپاہی قریب پہنچ کر اُسے گھور رہا تھا۔

اسلم نے گھبرا گھبرا کر اپنے بارے میں کچھ بتایا۔

"چوری کر کے تو نہیں بھاگے ہو" —— سپاہی نے پوچھا۔

اسلم حیرت سے اُس کا منہ دیکھنے لگا۔

"اچھا اچھا —— وہ بائیں طرف منشی جی بیٹھے ہیں انہیں سب کچھ لکھوا دو۔ اور ——" اُس نے ہاتھ بڑھایا۔

اسلم نے ڈرتے ڈرتے دس کا ایک نوٹ سپاہی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"اس کے لئے بھی" —— سپاہی نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا جو برابر اپنی مونچھوں پہ تاؤ دے رہا تھا۔

اسلم نے جلدی سے ایک دس کا نوٹ اور نکالا۔

منشی جی کی ڈاڑھی، چشمہ سب اس کے گاؤں کے ماسٹر صاحب سے ملتا جلتا تھا۔ انہوں نے ایک موٹے سے رجسٹر میں لائینیں کھینچی، کچھ لکھا پھر قلم نیچے رکھ کر پوچھنے لگے۔

"بچپن کی کوئی نشانی ہے؟"

"نہیں!"

"کوئی تصویر؟"

"نہیں!"

"پھر تم اپنے ماں باپ کو کس طرح ڈھونڈو گے۔ تمہیں تو اپنا نام

بھی یاد نہیں۔"

"جی"

"سنو،" منشی جی ذرا جھکے۔ "ہو سکتا ہے تم کسی بہت امیر آدمی کے بیٹے ہو۔ یہ بڑی کوٹھی، موٹر، نوکر چاکر۔" اسلم کے اونچے ڈیل ڈول اور سنہری رنگت پہ نظریں جماتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "تب ہمیں بھول نہیں جانا۔"

"لیکن کب پتہ چلے گا۔؟"

"یہ تو اُن لوگوں کا کام ہے۔" منشی جی نے سامنے اشارہ کیا جہاں دروازوں پر ہر طرف چقیں پڑی تھیں اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آگے برآمدہ گھوم جاتا تھا۔ وہاں سے سپاہی، قیدیوں کی ہتھکڑیاں تھامے باہر نکل رہے تھے۔ اسلم چلنے لگا۔

"میری فیس" ——— منشی جی نے سخت چہرہ بنا کر ہاتھ آگے بڑھایا اسلم کا جی چاہا ایک مکا منشی جی کو رسید کرے ان کے ہاتھ میں تو بندوق بھی نہیں تھی۔ مگر اُسی وقت ایک سپاہی نے منشی جی سے آکر کچھ کہا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئے مگر باہر نہیں نکلے۔

"لاؤ" ——— سپاہی کے جانے کے بعد انہوں نے پھر ہاتھ پھیلایا۔ اسلم نے پانچ کا نوٹ اُن کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"کل آنا نہ کرنے"۔۔۔ منشی جی تشفی آمیز لہجے میں کہتے ہوئے اسلم سے پہلے کمرے سے باہر تھے۔

سڑک کے قریب بنے بڑے بڑے بنگلوں کے سامنے وہ رک گیا۔

"شاید میرا گھر ان ہی میں سے کوئی ہو"۔۔۔ قریب سے گزرتی ایک موٹر کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے موٹے سے آدمی کو دیکھ کر ٹھٹھکا۔

"میرا باپ ایسا کوئی آدمی بھی ہو سکتا ہے" پھر نہ سمجھ میں آنے والی سوچ پر خود ہی گردن ہلانے لگا۔

"منشی کہہ رہا تھا میرے ماں باپ بہت امیر ہو سکتے ہیں"۔۔۔ رات اُس نے رانجھے کو بتایا۔

"اور بہت غریب بھی"۔۔۔ رانجھے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں! بہت غریب بھی"۔۔۔ اسلم کے لئے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔

وہ جب تھانے جاتا دو چار روپے ضرور خرچ ہو جاتے اور ایک ہی جواب ملتا۔

"کچھ پتہ نہیں چلا"۔

اب وہ کچھ ہوشیار ہو گیا تھا۔ سڑکوں پر گھومتے گھومتے چیزوں کو دیکھنے کا عادی ہو رہا تھا۔ اُسے چیزوں اور انسانوں میں فرق نظر آنے

ٹکا ننھا چھوٹی بڑی، مہنگی سستی، اچھی بُری چیزیں ـــــ چھوٹے بڑے امیر غریب، اچھے بُرے لوگ۔

چار دن ہو گئے۔ اس کی جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا۔ ریل کا کرایہ، تھانے کی لوٹ اور بازار میں کھانا، سب کچھ ملا کر پورا ہو چکا تھا۔ اُس نے زندگی میں کبھی اتنے پیسے خرچ نہیں کیے تھے۔ گاؤں کی دوکانوں اور میلے ٹھیلوں میں دس بیس سے زیادہ بھلا کیا خرچ کرتا۔

"آؤ روٹی کھالو" ـــــ رانجھے نے اُسے آواز دی۔

اسلم جس شام یہاں آیا تھا تب ہی رانجھے کے گھر کھانا کھایا تھا ورنہ وہ ہمیشہ اُس کے بلانے پر ایک ہی جواب دیتا۔

"روٹی کھا آیا ہوں" ـــــ بس ایک کونے میں رات پڑ رہتا اور سویرے نکل جاتا۔

مگر آج وہ رانجھے کے ساتھ کھانے بیٹھ گیا۔ وہ کھا پی چکے تو رانجھے نے تمباکو سلگائی۔

"کچھ پتہ چلا؟"

"نہیں" ـــــ پھر اسلم نے رُندھی آواز میں کہا "روز بلاتے ہیں اور کچھ نہیں بتاتے بس پیسے لے لیتے ہیں کسی نہ کسی بہانے اور اب تو وہ بھی ختم ہو گئے"

رانجھا خاموش رہا۔

"رانجھا"

"ہاں"

"مجھے کام مل جائے گا" —— اُس نے جھجھکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں! کل پانچویں منزل کی چھت پڑے گی۔ بہت سویرے کام شروع کرنا ہے۔ اب تم سو جاؤ صبح اوورسیئر کے پاس چلے چلنا"

رانجھے نے اپنے کونے میں لیٹتے ہوئے جواب دیا۔

نیند کی گولی

وکٹورین طرز کی اونچی چھت میں لگے ہوئے لمبی راڈ والے پنکھے آہستہ آہستہ بڑے وقار سے گھوم رہے تھے۔ ہال نما وسیع کمرے میں پرانا مگر قیمتی قالین دیواروں تک پیوست تھا۔ لمبی چوڑی شفاف میز پر سرخ، سفید اور سیاہ ٹیلی فون قطار میں دھرے جگمگا رہے تھے۔ چھوٹی سی آبنوسی ٹرے پر ہاتھی دانت کا چاقو لیٹا تازہ ڈاک کا انتظار کر رہا تھا۔ فائلوں کے ریک میں بے شمار فائلیں مُنہ چھپائے آگے پیچھے اَٹکی ہوئی تھیں۔

رفیق نے گھومنے والی کُرسی پر ذرا سا جھک کر سگریٹ سُلگایا اور ایک ٹائپ کی ہوئی درخواست پر نظر ڈالنے لگا۔ دس برس سے وہ ایسے ہی نفیس اور شاندار دفتروں میں کام کر رہا تھا۔

"آپ کی کال ہے سر"، سیکرٹری کی کھنکتی ہوئی آواز آئی۔

"ہلو ——— کلب سے بول رہی ہوں۔ تم ابھی تک بیٹھے ہو؟"
دوسری طرف فریدہ تھی۔

"آج کام بہت تھا۔ ابھی ابھی ختم ہوا ہے۔" رفیق نے جماہی لینے کے انداز میں کہا۔

"کتنی دیر میں پہنچ رہے ہو؟"

"میں آج تھک گیا ہوں۔"

"تب تو اور بھی اچھا ہے۔ یہاں آکر ریلیکس کر لینا۔" فریدہ نے فون رکھ دیا۔

رفیق نے گھڑی دیکھی، پانچ بجنے والے تھے۔ صبح سے اتنے لوگ ملنے آئے۔ بے شمار فائلیں دیکھنی پڑیں۔ دو وفد آئے جن سے سر کھپاتے اور بولتے بولتے اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ وہ گھر جا کر اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہن کر چائے کی ایک گرم پیالی پینا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اپنی لائبریری میں جو اس نے بڑے شوق سے بنائی تھی بیٹھ کر اچھے اچھے ریکارڈ سُننا چاہتا تھا۔ اُن کتابوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جو عرصے سے بند پڑی تھیں۔ مگر فریدہ ——— وہ جتنا اچھا افسر تھا اتنا ہی اچھا شوہر بھی۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی نے اس کا سیاہ بیگ اُٹھا لیا اور پنکھوں کے سوئچ بند کرنے لگا۔

فریدہ نے اپنا پانچواں چکّر پورا کیا اور سوئمنگ پُول سے باہر آکر لمبی کُرسی پر بیٹھ گئی۔ گیلے جسم سے ہوا نے رگڑ کھائی تو اسے جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ بڑا سا تولیہ اس نے ٹانگوں پر پھیلا لیا اور سر کُرسی کی پُشت سے ٹکا کر سامنے دیکھنے لگی۔ ایک لڑکا اور لڑکی بھاگتے ہوئے آئے اور چھینٹے اُڑاتے تالاب میں کود گئے۔ پانی کے اندر ان کے ہونٹ آپس میں ملے اور پھر وہ کھکھلاتے ہوئے سطح پر آ گئے۔ دو لڑکیاں تالاب سے نکل کر قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئیں۔

"تم اپنے بال اُتارتی ہو؟"

گوری لڑکی نے، سانولی لڑکی کی لانبی چکنی ٹانگوں پر رشک سے نظریں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو۔"

"میرے لئے یہ اچھی خاصی مصیبت ہے۔"

"آجکل کس بیوٹی پارلر میں جاتی ہو؟"

"کہیں بھی نہیں۔ مجھے ایک بھی پسند نہیں۔ اِس مرتبہ تم باہر جاؤ تو میرے لئے ویکس کا ایک بڑے سائز والا جار ضرور لے آنا۔"

"ضرور۔" سانولی لڑکی نے گردن ہلائی۔

"مجھے رات شادی میں جانا ہے۔"

"کیا پہنو گی؟" گوری لڑکی نے پوچھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک ہری ساری آج ہی تیار ہو کر آئی ہے مگر اس پر بنا ہوا کام ـــــــ"

فریدہ آہستہ آہستہ بچّوں کے سوئمنگ پول کی جانب چل دی۔ سیاہ کاسٹیوم میں اس کا بھرا بھرا جسم بہت خوبصورت لگتا تھا۔ کئی نگاہیں اُس کی جانب اُٹھ گئیں۔

بچّوں کے تالاب میں بیٹھ کر وہ دونوں بچّوں کو تھوڑی دیر تک تیرنا سکھاتی رہی مگر اب ہوا ٹھنڈی چل رہی تھی، انہیں باہر نکال کر آیا کے سپرد کیا۔ اور خود تیار ہونے کے لئے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

اندھیرا پھیل گیا تھا جب وہ باہر نکلی۔ لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس نے دیکھا رفیق نے برج روم سے باہر آ کر پینا شروع کر دیا تھا۔ جمال صاحب اور اُن کی بیگم بھی بیٹھے تھے۔ جمال سے وہ مل چکی تھی، مسز جمال کو اس نے دُور سے دیکھا بھاری جسم کی چالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھیں۔ بالوں میں تیل لگا کر چھوٹا سا جوڑا بنایا تھا اور ہاتھوں میں روح افزا کا لمبا سا گلاس تھامے غٹاغٹ پی رہی تھیں۔

اُس نے مسکرا کر سامنے لگے شیشے میں اپنی ساری کا جائزہ لیا۔ بالوں کو ہلکے سے تھپتھپایا اور مطمئن ہو کر اعتماد سے آگے بڑھنے لگی۔ وہ اُسے دیکھ

کر کھڑے ہو گئے۔ جمال نے کرسی کھینچ کر پیش کی۔

"آپ کیا پئیں گی ؟" ـــ جمال نے شائستگی سے پوچھا۔

"جین ویتھ ٹانک پلیز"

فریدہ نے جواب دیا اور مسز جمال کو دلفریبی سے دیکھ کر مسکرانے لگی جو اُس سے بہت مرعوب لگتی تھیں۔ آنے جانے والوں میں بہت سے لوگ رفیق اور فریدہ سے صاحب سلامت کرتے رہے۔ وہ سب ہشاش بشاش اور خوش لباس تھے مختلف اہم اور اونچے عہدوں اور شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔

"غالب نے کائنات کی بے ثباتی کا فلسفہ پیش کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس تمام گردش شب و روز، سال، مہینے، دن اور گھنٹوں کو کہیں نہ کہیں ثبات ضرور ہے ـــــ" فریدہ نے کنکھیوں سے دیکھا "آج ابھی سے بہکنے لگا" اس نے رفیق کے سنجیدہ موڈ کو محسوس کر کے سوچا اور قریب کی میز پر بیٹھی اپنی ایک سہیلی سے ملنے چلی گئی۔ مسٹر اینڈ مسز جمال عقیدت سے رفیق کی باتوں پر سر ہلاتے رہے۔ اتنے اعلیٰ افسر کی سنجیدہ اور غیر دفتری باتوں پر سر ہلانا بھی ایک کاروباری معاملہ تھا۔

کلب کے ڈائننگ ہال میں بھیڑ بہت تھی۔ فریدہ نے بُرا سا منہ بنایا۔ جمال اس کا موڈ بھانپ گیا۔

"اچھے سے ہوٹل میں چلتے ہیں" انہوں نے تجویز پیش کی۔

وہ سب جمال کی کار میں بیٹھ کر انٹر کانٹی نینٹل پہنچ گئے۔ جمال نے
کھانے کا آرڈر دیا۔ رفیق نے مزید ڈرنکس منگوائیں۔ اسٹیج پر کھڑے بینڈ
گروپ میں شانوں تک کھلا شام کا لباس پہنے ایک گوری سی لڑکی بھرپور
آواز میں گا رہی تھی۔ چند جوڑے ایک دوسرے سے چمٹے آہستہ آہستہ ہل رہے
تھے۔ جیسے ناچنے کی رسم پوری کر رہے ہوں۔ اچانک بینڈ نے ایک چلتی ہوئی
دُھن چھیڑ دی۔ بہت سے لوگ فلور پر پہنچ گئے۔ فریدہ نے بے چینی سے رفیق
کو دیکھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے جوڑوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ فریدہ
مگن ہو کر ناچتی رہی۔ ایک دُھن ختم ہوتی تو وہ دوسری کے انتظار میں ساڑی
اور بال درست کرنے لگتی۔ رفیق ذرا دیر میں تھک کر بیٹھ گیا تو جمال کو اس
کی جگہ لینی پڑی۔ مسز جمال اور رفیق اپنی اپنی نشستوں پر خاموش بیٹھے رہے۔
رفیق کو رقص کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ گھنٹوں ناچتا رہے۔
مگر ذرا سی دیر میں اُکتا جاتا۔ وہ تو ہر چیز سے اُکتا جاتا۔ پوری طرح کہیں
بھی دل نہ لگا پاتا۔ آخر کیوں؟ اس کے پاس سب کچھ تھا جس کی آرزو
لوگ خواب میں کرتے ہیں۔ رفیق نے اُچٹتی سی نظر سامنے ڈالی ناچنے والے
اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے تھے اور سامنے کھڑی کیبرے گرل کا جسم بل کھائے
اسپرنگ کی طرح اُچھل رہا تھا۔ آہستہ آہستہ شیفون کا جھلملاتا گون اُس کے
جسم سے اُترنے لگا۔ اچانک رفیق کو اپنے دماغ میں دُھواں بھرتا محسوس ہوا۔

کھٹا کھٹ، کھٹا کھٹ ایک بڑی سی ہیبت ناک مشین چل رہی تھی اور وہ اس میں ایک اہم پُرزے کی مانند اپنے محور پر آگے پیچھے ہِل رہا تھا۔ اگر اس کیبرے گرل کی طرح میں اچانک ہلنا بند کر دوں ؟ اگر رُک جاؤں تو۔ —— تو نکال کر پھینک دیا جاؤں گا اور میری جگہ —— دیمک زدہ پُرزوں کی طویل قطار اُس کے پیچھے کھڑی تھی۔ اُس کی جگہ لینے کے لئے بے چین۔

وہ گھبرا کر گلاس ہاتھ میں تھامے ہال سے باہر نکل آیا اور سیڑھیوں کے قریب ایک کرسی پر اندھیرے میں بیٹھ گیا۔ قریب ہی کہیں رات کی رانی کھل اُٹھی تھی۔ رفیق نے دو تین لمبے لمبے سانس لے کر اس خوشبو کو پکڑنے کی کوشش کی۔

"لالٹین بجھا کر سونا بیٹے" ماں نے تکیے پر سے سر اُٹھا کر کہا اور پھر سو گئیں۔ اُن دنوں وہ امتحان کی تیاری میں رات رات بھر پڑھا کرتا۔ چھوٹے سے صحن میں جہاں پھولوں کی کیاری تھی وہ شام ہی سے اپنی میز، کرسی اور بستر لگا لیتا۔ ماں ایک صراحی پر پیتل کا گلاس ڈھک کر رکھ دیتی اور قریب ہی رات کی رانی اور بیلا مہکا کرتا۔ صحن کے وسط میں امّاں، ابّا اور چھوٹے بھائی کی چارپائیاں بچھی ہوتیں، انگریزی ادب کا وہ رسیا تھا اور نمبر بھی اسے سب سے زیادہ اسی مضمون میں ملتے تھے۔ اشعار پڑھتے پڑھتے اس کی نظریں

اِرد گرد بھٹکتیں تو وہ عجیب سی کسک محسوس کرتا۔

"مَیں پاس ہو گیا تو سب سے پہلے اپنے لئے ایک شاندار لائبریری ضرور بناؤں گا۔ بھلا یہ بھی کوئی پڑھنے کی جگہ ہے۔ جہاں دُنیا بھر کی بہترین کتابیں، رسالے اور ریکارڈ ہوں گے۔ کیبنٹ میں نفیس مشروبات رکھی ہوں گی۔ وہاں میں اپنے آپ کو بند کر کے خوب لکھوں پڑھوں گا۔ ریکارڈ سنوں گا"

ایک آرام دہ لائبریری کا تصوّر اُس کی جان کو لگ گیا تھا۔ جب سے اس نے اپنے دوست کے ابّا کی اسٹڈی دیکھی تھی وہ مستقبل کے خواب اِسی انداز میں دیکھنے لگا تھا۔ یوں لگتا کہ اس کی پوری محنت ایک خوبصورت سی لائبریری کے گرد گھوم رہی تھی۔

اور اب اس کے پاس سجی سجائی لائبریری تھی۔ وہ جب بھی باہر جاتا ڈھیروں ریکارڈ اور کتابیں خرید لاتا جنہیں فریدہ نفاست سے الماریوں میں سجا دیتی۔ بیرا صبح و شام ایک ایک چیز اُٹھا کر اپنے جھاڑن سے چمکایا کرتا مگر رفیق لائبریری میں تب ہی بیٹھتا جب باہر کا کوئی پروگرام نہ ہوتا اور اُسے کھانے سے پہلے ڈرنکس کرنی ہوتیں۔

اُس کے چاروں طرف ایک سمندر تھا۔ خواہشوں، اندیشوں، مصلحتوں اور آرزوؤں کا سمندر! ان کے موج در موج حملوں سے بچ کر وہ کبھی کبھی

اُس جزیرے سے ٹکرا جاتا جو اس کے بچپن کا خواب تھا تو اپنے آپ کو اجنبی اور کھویا کھویا محسوس کرتا اور اس دُکھی اجنبیت سے بچنے کے لئے وہ جلدی سے مُنہ چھپائے دوبارہ لہروں کے ہجوم میں گُم ہو جاتا جہاں اُبھرنے اور ڈوبنے کا کھیل جاری تھا۔ جہاں بیکراں وسعتوں کے باوجود سب لہریں حبس اور خوف میں جکڑی ہوئی کناروں سے چمٹی ہوئی تھیں۔

"مجھے نکل جانا چاہیئے ـــــ نکل جانا چاہیئے" وہ دوبارہ خوشبو کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔

"کدھر جانا چاہیئے؟ ـــــ لالٹین کی بتّی کے پیچھے ـــــ وہاں روشنی بہت کم ہے۔ اندھا کر دینے کے برابر۔ اس چھوٹے سے آنگن میں۔ ـــــ مگر وہ خطرناک ہے چاروں طرف سے کھلا ہوا۔ غربت، گمنامی اور تکلیفیں کسی بھی وقت پھاند کر اندر آجائیں گی ـــــ کوئی دوسرا امتحان؟ ـــــ مگر اب میں کس امتحان کے قابل ہوں؟ میں تنہا بھی تو نہیں ہوں۔ اتنی بہت سی ذمّہ داریاں"۔

اُس نے جھنجھلا کر گلاس میں تیرتے برف کے ٹکڑوں کو دیکھا۔ اس کا جی چاہا گلاس اُٹھا کر پھینک دے مگر اتنے بھرے پُرے رنگین، اور جاندار گلاس کو پھینکنے کی ہمّت نہیں پڑی۔ اس کی انگلیاں شیشے کی ٹھنڈی سطح پر سختی سے جم گئیں۔

"تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ مسز جمال اکیلی بور ہو رہی ہیں۔" فریدہ نے پیچھے سے آ کر محبت سے اُس کے شانوں کو تھپتھپایا۔

"میں بیٹھا تھا تب بھی بور ہو رہی تھیں۔" رفیق نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ساتھ بھلا کوئی بور ہو سکتا ہے ؟" فریدہ گھوم کر سامنے آ گئی۔ رفیق اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ہال کی جانب چل دیا۔

مُرغی کی تلی ہوئی ایک ٹانگ ہاتھ میں پکڑے مسز جمال آنکھیں پھیلائے میز پر رکھے اتنے بہت سے عمدہ کھانوں کو دیکھ رہی تھیں۔

"بہت منگا لیا جمال نے" ـــــ رفیق نے ان سے ہمدردی جتائی۔

"آپ لوگ کھائیے تو"

"آہستہ آہستہ کھائیں گے" ـــــ رفیق نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا اور سامنے دیکھنے لگا۔

بینڈ ماسٹر مُسکرا مُسکرا کر ناچنے والوں کی ہمت افزائی کر رہا تھا۔ لوگ تیز کٹتی ہوئی دُھنوں کا ساتھ دینے کے لئے تمام قوتیں یکجا کئے جسم کے ہر حصّے کو بھگانے کی کوشش میں پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔

"تفریح میں تیز رفتاری کی یہ کیفیت کیسا سکون بخشتی ہے" اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا ـــــ "شاید میں خود ہی بور ہو گیا ہوں"۔ اور ہتھیلی کو میز پر آہستہ آہستہ مارنے لگا۔ دھپ دھپ کی آواز موسیقی کی لہروں

سے ہم آہنگ ہو گئی۔

دُور کونے والی میز پر جہاں روشنی کم تھی ایک نو عمر سی لڑکی بُری طرح بہک رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مرد کی گردن میں بانہیں ڈال کر اسے چومنے لگتی۔ بیرے نے منیجر کے اشارے پر اس میز کی بتّی گُل کر دی۔

ایک بہت بڑا گروپ آیا۔ انہوں نے آتے ہی بینڈ سے سالگرہ کے گانے کی فرمائش کر دی۔ ان میں سے کسی لڑکی کا جنم دن تھا۔ بینڈ نے "ہیپی برتھ ڈے" کی دھن چھیڑ دی۔

فریدہ فلور سے آکر میز پر بیٹھ گئی اور پلیٹ میں کھانا ڈالنے لگی۔

چاروں نے کئی مرتبہ جُھک جُھک کر ایک دوسرے کا شکریہ ادا کیا۔ دُودھ والوں کا ٹرک سڑک پر شور مچاتا گذر گیا۔ رفیق اور فریدہ گھر میں داخل ہوئے تو چوکیدار لیٹے لیٹے بنچ پر سو چکا تھا۔ بنچ کے نیچے موٹا تازہ ایل سیشن تھکا تھکا سا آنکھیں مُوندے بیٹھا تھا جیسے چوکیدار کی موجودگی میں اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہو گیا ہو۔

کپڑے بدلتے ہوئے رفیق کی آنکھیں بند ہونے لگیں مگر فریدہ سفید لیس کے گون میں ڈریسنگ روم سے بالوں کو برش کرتی ہوئی باہر آئی تو وہ نیند سے لڑنے لگا۔

"فریدہ"

"ہُوں"

"اب آجاؤ نا پلیز" وہ تکیہ کو بھینچتے ہوئے بولا۔

"یہ پردے پھیلا دوں ورنہ سو بھی نہیں سکیں گے" وہ نیلے ریشمی پردے کھڑکیوں کے شفاف شیشوں پر پھیلانے لگی۔ آیا سے کتنی مرتبہ کہا کہ شام ہوتے ہی کمروں کے پردے پھیلا دیا کرے مگر اسے کبھی یاد ہی نہیں رہتا۔ فریدہ نے جھنجھلا کر آسمان کے کونے میں پتلی سی اُجلی لکیر کو دیکھا جو تھوڑی دیر میں پھیل کر بڑھنے والی تھی۔ اور پلنگ پر بیٹھ کر گون کا ربن کھولنے لگی۔ رفیق نے اسے بے پناہ خواہش سے دیکھتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا مگر دوسرے لمحے تکان اور نشے سے چُور اس کا ہاتھ بستر پہ آن گرا۔ فریدہ نے پلٹ کر چند لمحے اسے خرّاٹے لیتے دیکھا اور کانوں تک سُرخ ہو گئی۔ کچھ دیر تک وہ چت لیٹی ہاتھوں کی اُنگلیاں توڑتی رہی۔ پھر گھبرا کر کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔

"روشنی آنے لگی تو سو بھی نہیں سکوں گی" جُھک کر اس نے نیند دلانے والی ایک گولی دراز میں سے نکالی اور نگل کر آنکھیں مُوند لیں۔

موسم خوشگوار تھا۔ کوٹ اتار کر سجّاد نے کاندھے پر ڈال لیا اور دور تک نظریں دوڑائیں۔ وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ تین دن سے متواتر وہ اُسے اِس سڑک پر دیکھ رہا تھا۔ آج اُس نے پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ ضرور اُس سے بات کروں گا۔ مگر وہ ابھی تک دکھائی کیوں نہیں دی؟

چلتے چلتے وہ ایک دوا فروش کی دوکان کے سامنے رک گیا۔ اُسے یاد آیا کہ اس کے پاس بالوں میں لگانے کی کریم ختم ہو گئی ہے۔ پیسے چُکا کر سجّاد باہر نکلنے کے لئے پلٹا تو دوسرے کاؤنٹر پہ وہ جھکی ہوئی کھڑی تھی۔ لڑکی نے گردن اٹھا کر یوں ہی سا اُسے دیکھا اور پھر اپنے سامنے رکھی ہوئی بہت سی لپ اسٹکوں کو کھول کھول کر اُن کے رنگ آزمانے لگی۔ اُس کے گھنگھریالے بال ایک ربن سے بندھے تھے اور پیچھے سے پتلی سفید

گردن کا خم بہت بھلا لگ رہا تھا۔ سجاد آہستہ آہستہ چلتا ہوا لڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی نازک انگلیوں میں ایک سُرخی پکڑے آئینے میں دیکھ رہی تھی۔

"یہ رنگ آپ پر بہت سجے گا"—— لڑکی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر منہ کھولا۔ سجاد کانوں تک سرخ ہو گیا اور جلدی سے باہر نکلنے لگا۔

"کیا واقعی یہ رنگ اچھا ہے؟" لڑکی مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

وہ دونوں کچھ دور تک ساتھ ساتھ چلتے رہے۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟"—— لڑکی نے رُکتے ہوئے پوچھا۔

"پتہ نہیں کئی دن سے آپ سے ملنے اور بات کرنے کی خواہش تھی۔ اب سوچ رہا ہوں کدھر جاؤں؟"

"یہاں سے قریب ہی چڑیا گھر ہے"—— لڑکی ہنس دی۔

سجاد نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔ لڑکی کے لہجے کی بے ساختگی اور کھنکتی ہوئی ہنسی اُسے بہت بھلی لگی۔ وہ بھی کوئی انیس بیس برس کی ہو گی۔ گہرے نیلے رنگ کے شلوار سوٹ میں اُس کا دبلا پتلا جسم بہت نازک اور دلکش لگ رہا تھا۔ چھوٹے سے زرد چہرے پر دو بڑی بڑی سیاہ روشن

آنکھیں سجاد کو اپنے وجود میں بستی معلوم ہوئیں۔ اُن میں ایک ساتھ بہت سے احساسات کروٹیں لے رہے تھے۔ کچھ تھکی ہوئی اور بوجھل سی حسّاس آنکھیں! جو لمحہ بھر شوخی سے مسکراتیں پھر اداس اور مدھم ہو جاتیں۔

سجاد کو محسوس ہوا کہ وہ اس لڑکی کو ایک دم سے پسند کرنے لگا ہے۔ اس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا ہے۔

"مجھے وہاں کا راستہ نہیں معلوم" ــــــ اُسے موہوم سی امید تھی کہ شائد اسی بہانے یہ ملاقات طویل ہو جائے۔

"اچھا میں راستہ دکھا دیتی ہوں" ــــــ وہ سادگی سے بولی۔

سجّاد کا دل خوشی سے اچھل کر حلق میں آگیا۔ اب وہ بارونق علاقے سے نکل کر نسبتاً پُرسکون سڑک پر چل رہے تھے جس کے دونوں جانب اونچے اونچے درخت تھے۔ پتوں کے درمیان سے کہیں کہیں دھوپ چھن کر آتی تو لڑکی کا گہرا نیلا سوٹ روشن آسمان کا ایک حصّہ معلوم ہونے لگتا۔

"کتنی پاکیزہ اور شفاف لگتی ہے۔ جیسے ــــ جیسے ــــ سمندر کے جھاگ میں سے ایک لہر نکل کر خشکی پر آگئی ہو"۔

سجاد کے شاعرانہ ذہن نے سوچا۔ وہ لڑکی کے برابر میں چلتا ہوا اپنے آپ کو بہت مضبوط اور قد آور محسوس کر رہا تھا۔ کوئی راہ گیر انہیں دیکھتا

ہُوا قریب سے گزرتا تو سجاد کا سینہ فخر سے پھیل جاتا۔

لڑکی نے ایک لمحہ کے لئے سر اٹھا کر اُسے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

سجاد کو ایک دم سے اُس پر بہت پیار آیا۔ پھر اُس نے سوچا

مَیں نے ابھی تک باقاعدہ اپنا تعارف بھی نہیں کرایا ہے اور پھر بھی یوں

لگتا ہے جیسے اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ شاید ہمیشہ سے ——— چڑیا

گھر کے پھاٹک پر پہنچ کر وہ رک گئے۔

"مجھے سجّاد کہتے ہیں"۔ اُس نے جھجک کر کہا۔

"میرا نام نیلم ہے" ——— لڑکی نے بالوں کی ایک لٹ آنکھوں

پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"نیلم!"

وہ زیرِ لب دُہراتے ہوئے سوچنے لگا۔ "کتنا پیارا نام ہے ———

نیلم ——— نیلم ———"

وہ دیر تک گھومتے رہے۔ اِس دوران انہوں نے بہت سی باتیں

کیں ——— زیادہ وقت سجّاد بولتا رہا۔ وہ نیلم کو اپنے گھر، اپنی تعلیمی زندگی،

ماں باپ اور بھائی بہنوں کے بارے میں بتاتا رہا۔

"ہمارے گھر میں سب لوگ بہت سویرے جاگ اٹھتے ہیں۔ مجھے

صبح صبح ٹہلنا بہت پسند ہے۔ مَیں تمہیں بھی لے کر صبح صبح ———"

وہ اپنی بدحواسی پر جھینپ گیا۔" ابھی تک کسی لڑکی کے ساتھ سلیقے سے گفتگو کرنی نہیں آئی۔"

اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا مگر لگتا تھا نیلم نے اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ اپنی سوچ میں گُم تھی اور بظاہر سجاد کی باتیں بہت دلچسپی سے سن رہی تھی۔ سجاد کو اُس کا اتنی محبت اور اپنائیت سے باتیں سننا بہت اچھا لگا۔ جلد ہی اُس کی کوفت دور ہو گئی۔ وہ پھر اُسی طرح بے تکان بولنے لگا۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے پہلی مرتبہ کسی ہمراز، کسی دوست اور ہمدرد ساتھی سے مل رہا ہو۔ اُس نے آج تک کسی سے اپنے متعلق اتنی باتیں نہیں کی تھیں۔

"میں نے اپنے بارے میں اتنی باتیں کر ڈالیں اور تم نے کچھ بھی نہیں کہا۔" وہ نیلم کے برابر گھاس پر بیٹھ گیا۔

"مجھے تمہاری باتیں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔" وہ دھیمے سے بولی۔ "تم بہت مختلف ہو۔"

"لیکن میں تمہارے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔" سجاد نے محبت سے کہا۔

"میرے بارے میں؟" ــــــ نیلم کچھ چونک پڑی۔ "میری زندگی کچھ ایسی دلچسپ نہیں ہے۔" اُس کا لہجہ بہت پھیکا تھا۔

"اچھا کوئی اور بات کرتے ہیں" ـــــ سجّاد نے موضوع بدلتے ہوئے کہا ـــــ "اوہو ـــــ دو بج گئے۔ چلو کہیں کھانا کھائیں۔"

"مجھے تو بالکل بھوک نہیں" ـــــ نیلم نے کہا۔

"مگر مجھے تو ہے" ـــــ سجّاد نے بے تکلفی سے نیلم کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اٹھنے میں مدد دی پھر دونوں کپڑے جھاڑتے ہوئے پھاٹک کی سمت بڑھنے لگے۔

ریستوران میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ وہ ایک کونے والی میز پر بیٹھ گئے۔ مدّھم روشنی اور ہلکی دلنواز موسیقی۔ نیلم کے چہرے کا تناؤ کم ہونے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر صبح والی دلفریب مسکراہٹ تیرنے لگی۔

"میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں" ـــــ سوپ پیتے ہوئے نیلم نے پہلی مرتبہ اپنے بارے میں کوئی بات کی ـــــ "میری ممّی نے مجھے گھر پر ہی پڑھایا تھا۔ میں کبھی اسکول کالج نہیں گئی" ـــــ وہ کہتے کہتے اداس ہو گئی۔

"اس میں رنجیدہ ہونے کی کیا بات ہے۔ تم اتنی مہذب اور پُراعتماد لگتی ہو۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں سے کہیں زیادہ۔"

نیلم نے لمحے بھر کو رُکھائی سے سجّاد کو دیکھا مگر اس کی آنکھوں میں خلوص اور محبت کی چمک دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔

"دراصل میں ہمیشہ بیمار رہتی تھی اس لئے مجھے اسکول میں داخل نہیں کرایا گیا۔"

سجّاد نے اُس کے چھوٹے سے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ کھانا کھاتی رہی۔ کھاتے کھاتے وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی۔ جیسے یوں کسی اجنبی کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھ کر کوئی اُسے پہچان نہ لے۔

کھانا کھا کر وہ باہر نکلے تو سردی بڑھ گئی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہو چکی تھی۔ ٹھنڈے ہوا کے جھونکے نیلم کے چہرے سے ٹکرائے تو اس پر بھیگی بھیگی سی سرخی پھیل گئی۔ وہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔

"تم نے کوئی گرم کپڑا بھی نہیں پہنا ہے" ـــــ سجّاد نے فکرمند ہو کر کہا۔

"صبح تو کچھ گرمی سی تھی اور میرا ارادہ اتنی دیر باہر رکنے کا نہیں تھا" ـــــ نیلم سردی سے کانپتے ہوئے بولی۔

سجاد نے اپنا کوٹ اتار کر اس کے کاندھوں پر ڈال دیا۔

نیلم نے سر اوپر اٹھایا ـــــ اُس کی سیاہ حسّاس آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"میرا گھر یہاں سے قریب ہے تم ساتھ چلو تو میں کوٹ واپس کر دوں گی۔"

"بس"، سجّاد نے شوخی سے کہا۔

"اور کافی بھی پلاؤں گی"—— وہ مسکرا دی۔

وہ ایک پرانا سا احاطہ تھا جس میں چند فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ احاطے میں ہر طرف کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا تھا۔ جیسے وہاں مہینوں سے صفائی نہیں کی گئی ہو۔ باہر سے سب فلیٹ ایک جیسے تھے۔ سجّاد نیلم کے پیچھے پیچھے زینہ چڑھنے لگا۔ سیڑھیاں اندھیری اور گیلی گیلی تھیں یوں لگتا تھا وہاں دھوپ کا کبھی گزر نہیں ہوتا۔ دوسری منزل پر پہنچ کر نیلم رک گئی۔ پرس میں سے چابی نکال کر دروازے میں لگائی اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ اندر اندھیرا تھا۔ نیلم نے جلدی سے بتّی روشن کر دی۔

یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کھڑکیوں پر سرخ پردے پڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر کمرے کی زرد دیواروں میں آگ سی بھڑکتی معلوم ہوتی تھی۔ کھڑکیوں کے نیچے ایک چھوٹا سا پلنگ تھا۔ پلنگ پر صاف ستھرا بستر بچھا تھا اور سرہانے ایک اونچا سا پرانی وضع کا فرشی لیمپ رکھا

تھا۔ فرش ایک سستے قسم کے بڑے بڑے سرخ اور سیاہ ڈیزائن والے قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ دیوار کے ساتھ ایک لمبا سا صوفہ تھا اور صوفے کے سامنے چھوٹی سی چائے کی میز۔ ایک کونے میں سنگھار دان پر آرائش کا بہت سا سامان سجا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ جڑی ہوئی بڑی سی کپڑوں کی الماری تھی جس کی پالش کئی جگہ سے اکھڑ گئی تھی۔ کمرے کے ساتھ ایک چھوٹا سا دروازہ باورچی خانے میں کھلتا تھا۔

"یہاں میں رہتی ہوں"——نیلم نے کمرے کے بیچ میں کھڑے ہو کر کہا۔ کوشش کے باوجود وہ اپنے لہجے کی تلخی کو نہیں چھپا سکی۔

"یہ جگہ تو بہت اچھی ہے"——سجاد نے اسے سہارا دیا۔ مگر اُسے بھی کچھ مایوسی ہوئی تھی۔ نیلم کو دیکھ کر اور اُس سے باتیں کر کے اُس کے ذہن میں دوسرا ہی نقشہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ نیلم اُسے کسی چھوٹے سے خوبصورت اور محفوظ بنگلے میں لے جائے گی۔ جہاں ڈرائنگ روم میں چائے کا سامان سجا ہوگا۔ ایک شفیق اور مہربان خاتون انہیں چائے بنا کر پیش کریں گی۔ ماحول میں ایک مخصوص گھریلو نرمی ہوگی مگر یہ تنگ کمرہ بہت ہی نم اور ٹھنڈا تھا۔ اس میں ایک عجیب سا کاروباری پن جھلکتا تھا۔ اس تجارتی شہر میں خود بخود ہی اُگنے والے بہت سے کمروں کی طرح! کمرے میں سامان کی زیادتی سے وہ اپنے آپ کو دبا دبا

محسوس کرنے لگا۔

"میں ابھی ہیٹر جلاتی ہوں"—— نیلم نے اُسے کوٹ دیتے ہوئے کہا۔

"یہ جگہ تم کو عجیب سی لگی ہوگی؟ مگر تم بیٹھتے کیوں نہیں ہو؟" اُس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور الماری میں سے ایک سیاہ شال نکال کر لپیٹ لی۔ وہ خاموشی سے اُس کے زرد چہرے کو دیکھتا رہا۔

"ہماری ایک کوٹھی شہر کے باہر ہے مگر جب سے ممی کا انتقال ہوا ہے، ڈیڈی کو بڑا گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔"

"اوہ —— مگر یہ جگہ اچھی بھلی تو ہے"—— سجاد نے اُسے تسلی دی۔

"نہیں میرا روز اسی بات پر ڈیڈی سے جھگڑا ہوتا ہے۔ اب تو میں تنگ آگئی ہوں۔ دراصل ممی اور ڈیڈی میں اتنی محبت تھی —— —— اتنی محبت تھی —— کہ لوگ ان کے پیار کی مثال دیتے تھے۔ پھر ممی کو کینسر ہوگیا۔ ڈیڈی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اُن کی تیمارداری میں لگ گئے۔ یورپ، امریکہ ہر جگہ اُن کو علاج کے لیے لے گئے مگر فائدہ نہیں ہوا۔ کام کرنا تو پہلے ہی چھوڑ رکھا تھا۔ ممی کے انتقال کے بعد تو ڈیڈی کا سارا کاروبار مہینوں میں چوپٹ ہوگیا اور وہ مقروض بھی ہو گئے۔ اچھی

خاصی جائیداد فروخت کر دی ـــــــ" وہ لمحہ بھر کو رکی۔

سجّاد کو محسوس ہوا کہ وہ سخت گھبراہٹ کے عالم میں جلدی جلدی بول رہی ہے جیسے سب کچھ فوراً ہی سنا دینا چاہتی ہو۔ اُسے نیلم پر رحم آنے لگا۔

"مجھے اپنا گھر بہت اچھا لگتا تھا۔ اُس گھر کے کونے کونے سے مجھے اپنی ممّی کی خوشبو آتی تھی۔ مَیں وہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتی تھی مگر آخر ہمیں وہ کوٹھی خالی کرنی پڑی اور اس فلیٹ میں آنا پڑا ـــــــ" وہ رک گئی اور سجّاد کو اس طرح دیکھنے لگی جیسے اپنی باتوں کی سچائی کا یقین دلانا چاہتی ہو۔

سجاد نے بڑھ کر نیلم کا ہاتھ تھام لیا۔

نیلم نے جلدی سے اپنا ہاتھ اُس کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اُس کا چہرہ بے جان لگتا تھا۔

"کیا چائے نہیں پلاؤ گی؟" ـــــــ وہ بڑے پیار سے بولا۔

نیلم اچھل کر باورچی خانے میں جا کھڑی ہوئی اور جلدی جلدی چائے کا سامان الماری سے نکالنے لگی۔ وہ دروازے میں ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

اُسے نیلم کچھ بے بس سی لگ رہی تھی، مگر وہ بہت خوش تھا۔ چھوٹا سا فلیٹ محبت کی گرمی سے لبریز تھا۔ اُسے یہاں کی ہر چیز سے اپنائیت محسوس

ہونے لگی۔

چائے کی پیالی تھماتے ہوئے نیلم کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"تمہارے ڈیڈی ابھی تک نہیں آئے۔"

"ہاں! معلوم نہیں کہاں چلے گئے" ــــــ نیلم نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

"خیر میں اُن کا انتظار کرتا ہوں" ــــــ وہ اطمینان سے دونوں پاؤں آگے پھیلا کر بیٹھ گیا۔

"نہیں ــــــ نہیں - - - - - - - - ــــــ تم کب تک اُن کا انتظار کرو گے؟ پھر مل لینا۔"

"کیوں؟ کیا وہ مجھ سے مل کر ناراض ہوں گے۔ میں تو یہاں بڑی نیک نیتی سے آیا ہوں۔"

"اسی لئے تو میں کہہ رہی ہوں کہ ــــــ تمہیں کچھ نہیں معلوم۔"

"کیا نہیں معلوم؟ ابھی تو تم نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔" سجّاد نے شوخی سے کہا۔

"کیا؟ ــــــ" وہ یوں چونکی جیسے دہکتے انگارے پر ہاتھ پڑ گیا ہو۔

"تمہاری باتوں سے تو لگتا ہے کہ وہ بہت سیٹھ ہیں اور مجھے

دیکھ کر ناراض نہیں ہوں گے۔"

"اوہ ـــــــ" نیلم نے گہرا سانس لیا۔ جیسے بہت لمبی دوڑ لگا کر آئی ہو۔

پھر انہیں وقت کا اندازہ نہیں رہا۔ باہر رات کا اندھیرا گہرا ہونے لگا۔

"اب تم جاؤ ڈیڈی بہت دیر میں آئیں گے۔" ـــــــ نیلم نے کھڑکی کے پردے برابر کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم کہتی ہو تو چلا جاتا ہوں۔ مگر دیکھو ٹھنڈ کتنی بڑھ گئی ہے ایک پیالی کافی تو پلا دو۔"

نیلم باورچی خانے میں چلی گئی۔ سجاد تھوڑی دیر اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"نیلم!"

"ہوں!"

"یوں لگتا ہے میں تمہیں برسوں سے جانتا ہوں۔" اُس نے کاندھوں سے پکڑ کر نیلم کا چہرہ سامنے کرتے ہوئے کہا۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔

"تمہیں دیکھ کر زندگی میں پہلی مرتبہ ـــــــ" اُس نے نیلم کا لرزتا جسم اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ اُسی لمحہ فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ڈیڈی

اندر آ گئے۔ نیلم کے ہاتھوں سے نمک دان گر کر چکنا چور ہو گیا۔ سجّاد گھبرا کر کمرے میں آ گیا۔

ڈیڈی کا سر سفید گھنے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان کی عمر پچاس پچپن کے بیچ میں ہو گی مگر بہت بوڑھے لگتے تھے۔ کمر جھکی ہوئی جیسے برسوں سے سیدھا چلنا چھوڑ دیا ہو۔ چہرے پر بے بسی چھائی ہوئی تھی۔ گھنی پلکوں کے پیچھے دو دھنسی دھنسی آنکھیں مدھم اور شرمندہ سی لگتی تھیں۔ ان کی گردن میں قدرتی سا خم تھا اور کسی ناکردہ گناہ کے بوجھ سے جھکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پتلون اور پرانا سا کوٹ پہنے تھے۔ اُن کے جوتے کیچڑ اور مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔

ڈیڈی کو دیکھ کر نیلم کا چہرہ لمحہ بھر کو فق ہو گیا پھر اُس پر نفرت سی چھا گئی مگر جلد ہی اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ وہ سجّاد کے پیچھے کمرے میں چلی آئی۔ ڈیڈی سر جھکائے صوفے پر بیٹھ گئے۔ وہ سجّاد سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ سجّاد کو محسوس ہوا کہ شاید وہ ناراض ہیں۔ ایسے موقع پر اُن کے یوں اچانک آ جانے سے وہ بڑی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

"آج میرے جسم میں سخت درد ہے۔ دراصل کل ساری رات باہر ٹھنڈ کھاتا رہا اُس سے بخار بھی بہت تیز ہو گیا ہے" —— ڈیڈی نے سجّاد سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"اور آج بارش بھی ہونے لگی ——"

"ڈیڈی !" —— نیلم زور سے چیخی۔

اُس کی آنکھیں وحشت اور کسی خوف سے پھیل گئی تھیں۔ مگر ڈیڈی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ انہوں نے سجّاد کو رحم طلب نظروں سے دیکھا۔ پھر اپنے چاروں طرف بے بسی سے نظریں دوڑاتے ہوئے بولے۔

"تم مت جاؤ! مَیں یہاں صوفے پر دیوار کی طرف منہ پھیر کر سو جاؤں گا۔" وہ کہتے کہتے جوتوں سمیت صوفے پر کروٹ لے کر لیٹ گئے جیسے عملی مظاہرہ کر کے سجّاد کا اطمینان کرنا چاہتے ہوں۔

سجّاد کی نظروں میں کمرہ لٹّو کی طرح گھومنے لگا۔ نیلم اُس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی تھی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اور اندھیرے زینے میں تیزی سے بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگا۔

ہندوستانی، پاکستانی

"تم پیدل چلنے کی عادی نہیں رہیں" ـــــ احمد نے نجمہ کی بانہہ تھام کر اسے اپنے بائیں جانب کرتے ہوئے کہا۔

وہ واقعی آج کل پیدل بہت کم چلتی تھی۔ طویل عرصے کے بعد لندن آئی تو میلوں چلنے اور بھاگ کر بسوں اور زمین دوز ریل گاڑیوں میں چڑھتے ہوئے اس کے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ مسکرا کر اُس نے اپنے کوٹ کا کالر اوپر کر لیا اور جھک کر ایک اسٹور کے بڑے سے شیشے میں نئے فیشن کے کپڑے دیکھنے لگی۔ ایک ماڈل تنگ پائنچوں کی شلوار پر لمبی سی قمیص پہنے اسٹائل سے ایک پاؤں ذرا آگے کو بڑھا کے کمر پہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

"کل میری بیٹی ایسا لباس خرید کر لائی ہے" ـــــ احمد نے کہا۔

"بہت پیاری لگتی ہوگی تمہاری بیٹی ان کپڑوں میں" ـــــ نجمہ نے

آگے بڑھتے ہوئے ذرا پھیکے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں!" احمد نے فخر سے جواب دیا۔

"تمہیں اپنے بچّوں سے بہت محبت ہے؟"——سوال بے تکا تھا۔

احمد جھنجھلا گیا۔

"تم کچھ خریدنے آئی تھیں یا سردی میں کھڑے باتیں کرنے"۔

وہ آگے بڑھ گئے۔ برٹش ہوم اسٹور بند ہو رہا تھا۔

نجمہ نے کچھ ضروری اور کچھ غیر ضروری چیزیں خریدیں۔ شاپنگ کرنے میں وہ ہمیشہ گڑبڑ کرتی تھی۔ دام چکا کر وہ باہر نکلے تو بارش شروع ہو گئی تھی۔ احمد نے اپنی چھتری کھول لی وہ دونوں اس کے نیچے ہو کر آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ بہت بھیڑ تھی، لوگ تیزی سے چلتے ہوئے قریب سے گزرتے تو انہیں بار بار دھکا لگتا۔ آکسفورڈ سرکس پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ احمد نے گھڑی دیکھی ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ مگر جمعہ کی شام کا ہنگامہ شروع ہو گیا تھا۔

"تم تھک گئی ہو؟" نجمہ نے سر ہلایا۔

"آؤ تھوڑی دیر آرام کر لیں"——احمد اسے لے کر ایک بار میں داخل ہو گیا۔

جھلکتے ہوئے لیمپ شیڈز کی مدھم روشنی میں نیچی نیچی کرسیوں پر لوگ

بیٹھے تھے۔ سر جوڑے باتیں کر رہے تھے یا اپنے گلاس سامنے رکھے خاموشی سے موسیقی سن رہے تھے۔ احمد وہسکی کے گلاس میں پڑے برف کے ڈلے آہستہ آہستہ ہلاتا رہا پھر چمچ سے ایک ٹکڑا نکال کر منہ میں رکھ لیا اور بڑی مٹھاس سے بولا۔

"کوئی بات کرو۔"

"ہنھ" ——— منہ کھولے بغیر نجمہ نے کہنیاں میز پہ ٹکا دیں اور سر جھکا لیا۔ اُس کے سیاہ گھنگھریالے بالوں میں سیدھی مانگ کے دونوں طرف سفید بال بجلی کی طرح لہرائے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسائے ہوئے اُس نے غور سے احمد کی آنکھوں میں جھانکا اور بار کے آدھے ڈھکے شیشوں میں سے سڑک پر اُس چھوٹے سے کتے کو دیکھنے لگی جو زنجیر میں بندھا دو لانبی ٹانگوں کے پیچھے چل رہا تھا۔ شیشے میں سے زنجیر تھامنے والا ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"کیا ہم سب یوں ہی کسی نہ کسی زنجیر سے بندھے زندگی کا سفر طے نہیں کر رہے ؟" ——— نجمہ اپنے گلاس کی نم سطح پہ اُنگلیوں سے نشان بناتی رہی۔ پھر بھنے ہوئے خشک نمکین میووں کی پلیٹ میں سے ایک کاجو اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ احمد نے دیکھا اُس کے صندلی ہاتھوں کی رنگت سنولا گئی تھی۔ بینڈ اب بہت تیز دھن بجا رہا تھا۔ سامنے چھوٹا سا ڈانس فلور

ناچنے والوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ سب اپنے اپنے انداز میں رقص کر رہے تھے نجمہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ پھر خاموش ہو گئی۔ اس شور میں اُس کی آواز احمد تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

"فائدہ بھی کیا؟ کہنے سننے کا زمانہ کب کا ختم ہوا۔"

اُن کے کالج کا سالانہ بال تھا۔ وہ دونوں ابھی ابھی امتحانوں سے فارغ ہوئے تھے اور بے فکری کے موڈ میں تھے۔ سیاہ گھنگھریالے بالوں کی چھوٹی چھوٹی لٹوں کو جھٹک کر پیچھے کرتی نجمہ کالی ساری اور چھوٹی آستین کے بلاؤز میں روانی سے رقص کرتے ہوئے بڑی رومینٹک لگ رہی تھی۔ بہت سے لڑکے اس سے رقص کی فرمائش کرتے۔

"مجھے افسوس ہے۔ احمد نے پہلے سے کہہ رکھا ہے۔" وہ خوش دلی سے انکار کر دیتی۔

اُس زمانے میں ڈسکو ڈانسنگ اور راک این رول کا رواج نہیں تھا کشادہ ڈانس ہالوں میں لوگ فراخ دلی سے سوشل ڈانس کیا کرتے تھے۔ والٹز کی ایک تیز دھن پر چکّر لگاتے لگاتے وہ کچھ پینے کے لئے کونے کے کاؤنٹر پر رک گئے۔

"تم نے فیصلہ کر لیا؟" —— نجمہ نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!"

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا"—— نجمہ کو ہال میں پھیلا کیف و نشاط ایک دم سے بہت بے ہودہ معلوم ہوا۔

"علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ، کہیں سے بھی تو جواب نہیں آیا۔ اب اتنی اچھی آفر ٹھکرا دوں محض اس لئے کہ کراچی یونیورسٹی میں ملازمت کرنی ہے۔ پھر میں یہاں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتا۔ میرے والدین امیر نہیں ہیں۔ مجھ پر چھوٹے بھائی بہنوں کی ذمہ داریاں ہیں"

"تم پچھتاؤ گے!"—— گھنگھریالے بالوں کو دائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے تھپتھپاتے ہوئے وہ شاید ذہن میں ابھرتے طوفان کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سگریٹ راکھ دان میں بجھا کر وہ کھڑا ہو گیا۔ آرکسٹرا نے تیز تھرکتی ہوئی ہسپانوی دھن چھیڑ دی۔

"آؤ"—— وہ نجمہ کا ہاتھ تھامے فلور پہ آ گیا۔

"آج تم ہندوستانی لوگ بہت موڈ میں ہو"—— لمبے دبلے مارک نے ان کے قریب آکر ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی ہندوستانی، پاکستانی"—— نجمہ نے مسکرا کر احمد کو دیکھا۔

"یہ فیصلہ ابھی ابھی فلور پر ہو گیا کیا؟"—— مارک کی ساتھی ڈیلری

نے گردن گھمائی۔

احمد کھسیا گیا۔ شدت سے اُس کا جی چاہا کہ نجمہ کو دھکا دے کر اپنے سے جدا کر دے اور ہال سے باہر نکل جائے۔ دوسرے لمحے ایسی نیچ حرکت کا خیال کر کے وہ کانوں تک سرخ ہو گیا اور ملامت بھرے پیار سے نجمہ کو دیکھنے لگا۔

"پاکستان میں کافی گڑبڑ ہے۔ میں ابھی ریڈیو سن کر آ رہا ہوں۔ کراچی میں طالب علموں کے ایک جلوس پہ گولی چلی ہے"۔۔۔ مارک نے سنجیدہ لہجے میں اطلاع دی۔

"اور کئی نوجوان مرے ہیں ۔۔۔ سوری یار! تمہارا موڈ تو خراب نہیں کیا میں نے؟"۔۔۔ مارک نے معذرت کی۔

اب احمد بہت تھک گیا تھا۔ وہ دونوں کونے کی ایک میز پہ آ کر بیٹھ گئے۔

"آج تم کچھ زیادہ نہیں پی رہے؟" نجمہ نے احمد کے تُتے چہرے کو ایک نظر دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو ۔۔۔ میں جانتا ہوں مجھے کب ختم کر دینا چاہیئے"

"جانتی تو میں بھی ہوں کہ مجھے کب ختم کر دینا چاہیئے مگر تمہاری طرح مضبوط نہیں ہوں"۔۔۔ اس مرتبہ نجمہ کوشش کے باوجود اپنی

آواز میں آنسوؤں کی آمیزش پر قابو نہ پا سکی۔ اُس نے ٹٹول کر اپنے بیگ میں سے سگریٹ نکالی اور دو تین کش لے کر اٹھتے ہوئے بولی۔

"آؤ باہر چلیں۔ میں بڑی گھٹن محسوس کر رہی ہوں۔"

"باہر چلو یہاں بڑی گھٹن ہے۔" ـــــ نجمہ نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ گزرے دنوں کی تپش اسے راکھ کئے دے رہی تھی۔ وہ بار سے باہر نکل آئے۔ اب سڑکیں نسبتاً سنسان ہو گئی تھیں۔ سامنے چوراہے کے بیچ میں اونچی سی لاٹ پر نلیسن کا مجسمہ آسمان پر اڑتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

"اس قدر اونچائی اور باریکی پہ مجسّمے کیوں بنائے جاتے ہیں؟" ـــــ اوپر دیکھنے سے نجمہ کی گردن دکھنے لگی۔ نومبر کی اس سرد رات میں نجمہ کے ساتھ چلتے ہوئے احمد برسوں پرانی اڑی اڑی سی خوشبو میں کھو گیا۔

اُس رات ڈانس ہال سے باہر آتے ہوئے نجمہ کو کوٹ پہناتے ہوئے احمد سوچ رہا تھا۔

"یہ نجمہ اتنی دور لندن آگئی ہے مگر ابھی تک اس میں ہندوستان کی مہک بسی ہوئی ہے۔ جیسے چاندنی رات میں اچانک رات کی رانی جھوم کر مہک اٹھے ـــــ مگر صرف ہندوستان کی مہک کیوں؟ ـــــ آخر

پاکستان کی کیوں نہیں؟" ـــــ وہ اپنی سوچ پر چڑ گیا۔ "میں آدھا آدھا کیوں ہوتا جارہا ہوں۔"

باہر نکل کر اُس نے دو تین گہرے سانس لئے۔ پت جھڑ کا زمانہ کب کا بیت چکا تھا ـــ پیڑ ابھی ویران تھے۔ سُونی ڈالیوں پر سے دو پرندے پھڑ پھڑا کر اڑے۔

"رات میں چڑیوں کا اڑنا بہت وحشت ناک لگتا ہے"۔
نجمہ نے دور ہوتے چڑیوں کے سفید پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور انسانوں کا چلنا؟ ـــــ میرے ساتھ چلتے ہوئے تو وحشت نہیں ہوتی؟" ـــــ احمد نے اسے بے ساختگی سے لپٹا لیا۔

"کیا تم نے ہم دونوں کے بارے میں سوچا ہے؟" ـــــ نجمہ نے ہمت کر کے پوچھا۔

موسیقی کی لے آسمان پر جلتے بجھتے ستاروں کی طرح کبھی تیز اور کبھی مدھم اُن تک پہنچ رہی تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ کافی دور نکل آئے تھے۔

"تم میرے ساتھ کیوں نہیں چلتیں؟" ـــــ پتھریلے راستے پر احمد کے جوتوں کی کھٹ کھٹ میں اس کے الفاظ گھل مل گئے۔

"اوہ ـــــ" وہ ذرا ہٹ کر چلنے لگی۔

"تمہیں وہاں بہت اچھی ملازمت مل جائے گی۔ ایک مرتبہ چلنے میں

کیا نقصان ہے؟ ——پسند نہیں آئے گا تو واپس چلی جانا" —— وہ بڑی کوشش سے بول رہا تھا۔

"واپس جانا اتنا آسان نہیں ہو گا۔ اور میں کچھ چھوڑنے کے لئے نہیں اپنا تی" —— نجمہ نے اکتا کر جواب دیا۔

"میں اب واپس ہوسٹل جانا چاہتی ہوں" —— وہ سڑک پار کر کے مڑ گئے۔

"یاد ہے اس موڑ پر ایک چھوٹا سا تھیٹر تھا" —— نیشنل آرٹ گیلری کے نکڑ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے احمد نے نجمہ کو یاد دلایا —— "ہم نے کتنی بہت سی آرٹسٹک فلمیں دیکھی تھیں یہاں ——"

"ہاں! وہ تھیٹر کہاں ہے؟" —— نجمہ نے یاد کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہے تو یہیں مگر اب اُس میں سیکس فلمیں چلتی ہیں۔"

"اوہ ——"

سڑک کی روشنیاں سامنے کوکا کولا کے بڑے سے چونکا دینے والے اشتہار کی جلتی بجھتی روشنیوں کے سامنے بجھ سی گئی تھیں۔ ایک لڑکی اپنے ساتھی کے کاندھے پر جھکی چل رہی تھی۔ مرکزی لندن کی اس سڑک پر بہت سی فضائی کمپنیوں

کے دفتر کھل گئے تھے۔

فلائی سعودیہ۔

فلائی جاپان ایئرویز۔

فلائی برٹش ایئرویز۔

فلائی انڈین ایئر وے۔

فلائی پی آئی اے۔

"فلائی روبن، فلائی، اَپ اَپ اِن دی اِسکائی ———"

(FLY ROBIN FLY, UP UP IN THE SKY)

کسی بار یا پب کا دروازہ لمحے بھر کو کھلتا تو موسیقی کی تیز آواز آرپار ہو جاتی۔

"مجھے دو ماہ کی مہلت دیجئے۔ میں پانی کے جہاز سے سفر کر رہا ہوں۔"
احمد نے یونیورسٹی والوں کو لکھا۔

مسافر بردار جہاز "سرکیشیا" ——— کے وسیع عرشے پر احمد کہنیاں ٹکائے کھڑا تھا۔ سامنے کراچی کی بندرگاہ تھی۔ آسمان پر سورج نکلنے سے پہلے کی سنہری گلابی پھیل رہی تھی۔ قریب سے ایک لانچ چھینٹے اڑاتی گزر گئی۔

مچھیرے اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیاں لئے کھلے سمندر کا رُخ کر رہے تھے۔ کچھ
سمندر سے واپس آ رہے تھے۔ ایک ٹگ کی چمنی سے نکلتا دھواں فضا کے غبار میں
باریک سی سیاہ لکیر بن گیا تھا۔ بڑا سا کرین امریکی امداد سے بھرے ایک جہاز کے
اندر منہ ڈالے کھڑا تھا۔ بھٹ شاہ کے جزیرے پر پھیلی ہریالی میں جو پانی پیا گی
معلوم ہوتی تھی چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ سفید مرغابیوں کا ایک جھنڈ اڑتا ہوا
آیا اور پانی میں غوطہ لگا کر اوپر چلا گیا۔ اب پھیلتی روشنی میں شہر کے نقوش
ابھر رہے تھے۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کا گنبد، ٹاور کا مٹیالا مینار اور قمر ہاؤس
کی گلابی عمارت سب آہستہ آہستہ واضح ہوتے جا رہے تھے۔ احمد کو اپنے اندر
کچھ ٹوٹتا، کچھ مٹتا محسوس ہوا۔

چار سال قبل بمبئی سے انگلستان جانے کے لئے وہ جہاز میں سوار
ہو رہا تھا تو آس پاس کسی چیز کو دیکھنے اور سمجھنے کا اسے خیال آیا نہ وقت ملا
چھوڑنے والوں کے ہجوم میں جہاز کی روانگی سے چند منٹ پہلے تک ہنستے ہنساتے
اور روتی ہوئی بہنوں کو گلے لگاتے وہ جہاز کی سیڑھیاں چڑھا تو گھنٹوں ان
یادوں میں کھویا رہا۔

"ہمارے ساتھ کی بہت سی لڑکیاں پاکستان چلی گئی ہیں اور جانے
کی تیاری کر رہی ہیں" انگلستان میں اُس کی بہن کا خط آیا تھا اور ناموں
کی طویل فہرست اس میں درج تھی۔ اُس کے لندن پہنچنے کے چند ماہ بعد

ہی پاکستان بن گیا تھا۔

"لڑکیوں کی عمریں بڑھتی جا رہی ہیں اور کوئی مناسب رشتہ نہیں آتا۔ سب اچھے لڑکے پاکستان چلے جاتے ہیں۔ وہاں ان کی ہم عمر لڑکیاں انہیں بن گئی ہیں" —— احمد کی ماں نے بڑی پریشانی کے عالم میں اُسے خط لکھا تھا۔

"اسلام علیکم بھائی جان، بھائی جان اسلام علیکم"۔

جہاز کی سیڑھیوں سے اترتے ہی مختلف عمروں کے رشتے دار لڑکے لڑکیوں نے اُسے گھیر لیا۔

وہ ہکا بکا کسی کے سر پہ ہاتھ پھیرتا رہا، کسی کو دعا دیتا رہا، کسی سے گلے ملتا رہا۔

"آپ ہمیشہ آداب کرتے ہیں۔ سلام کیوں نہیں کرتے ؟" احمد کے ایک ہم پیشہ استاد نے، جو طالب علموں اور نوجوان اساتذہ کے چال چلن پر کڑی نظر رکھتے تھے پوچھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے ؟"

"بہت فرق پڑتا ہے۔ ہم مسلمان ہیں ہمیں اسلام علیکم کہنا چاہیئے اپنے ہم مذہبوں پر برکت کی دعا۔"

"آداب کرنے والے کیا دوسروں پر لعنت بھیجتے ہیں ؟ ہمیں تو بچپن

سے آداب کرنا سکھایا گیا ہے۔"

"وہ اور وقت تھا۔ ہندوؤں سے میل جول کی نشانی تھی آداب کرنا۔"

احمد بھنایا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایسی جاہلانا گفتگو اُس کے بس سے باہر تھی۔

طالب علموں کے غول اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ کلاسوں میں جا رہے تھے۔ باہر نکل رہے تھے۔ وہ ستون سے ٹیک لگائے اِس نئی نسل کو دیکھتا رہا۔

"یہ کم عمر لڑکے لڑکیاں، جھکی گردنیں، کمزور جسم، سکڑے سہمے ہاتھ پاؤں انہیں ورزش، کھیل کود، کھلی فضا اور کھلے ماحول کی کتنی سخت ضرورت ہے ان کے ذہن اور جسم کسی کی بھی تو نمو نہیں ہو پائی ہے۔ اس عمر میں تو ذہن اور جسم کے اعضا اتنے کھلے ہوئے اور شاندار ہونے چاہئیں کہ روح کی بالیدگی آسمان کو چھو لے۔ یہ بے چارے بدقسمت، دبے دبے، شاید سیدھا چلنا اور صاف سوچنا بھی ان کا مقدر نہیں ——— وہ بہت افسوس سے نوجوانوں کو دیکھ کر سوچتا رہا۔

"یہاں پاکستان میں کام کرنے کی بہت ضرورت ہے تعلیم یافتہ اور روشن خیال استاد، جو طالب علموں کی رہنمائی کر سکیں۔ اُن میں لکھنے پڑھنے کی لگن پیدا کر سکیں۔ یہ طالب علم بہت ہمت اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ پڑھتے بھی ہیں اور کماتے بھی ہیں۔ پورے پورے کنبوں کی کفالت بھی کرتے ہیں۔ ہم تو اپنی تعلیمی زندگی کے دوران سوچ نہیں سکتے تھے کہ پانچ روپے بھی کما

کر گھر میں خرچ کرتے۔ یاد ہے کبھی ریڈیو پروگرام سے کچھ پیسے ملتے تو جھٹ اُس کی پارٹی ہو جاتی تھی ـــــ یہ سب کچھ دیکھ کر سوچتا ہوں میرے لیے کتنا بڑا چیلنج ہے۔ تم کراچی کیوں نہیں آجاتیں؟ ـــــ تمہیں کسی کالج، یونیورسٹی میں اچھی سے اچھی ملازمت مل جائے گی۔ اس ملک کو تمہاری اور میری اور ہماری طرح کے بے شمار اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت ہے۔ ـــــ کیا میرے پاس بھی نہیں آنا چاہتیں؟" ـــــ احمد نے نجمہ کو خط لکھا جو دہلی میں ابھی تک اپنی پسند کی کوئی اچھی ملازمت حاصل کرنے کے لئے سرگرداں تھی۔

"یہ بڑی تلخ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے لئے ملازمتوں اور مالی آسائشوں کے مواقع تنگ ہوتے جا رہے ہیں، مگر مجھے اعتماد ہے کہ حالات بدلیں گے۔ میں اس قدر جلد اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ کیا کروں حکمرانوں اور سیاستدانوں والی چابکدستی کہاں سے لاؤں؟ سیدھے سادے انسانوں کی طرح میری کچھ وابستگیاں ہیں بہت گہری۔ پیپل کے اُس پیڑ کی جڑوں کی طرح جو اب ہمارے گھر کے نیچے تک پھیل گئی ہے۔"

نجمہ نے جواب دیا۔ احمد کی آخری بات کا جواب وہ گول کر گئی۔ خط پڑھ کر وہ بہت جھنجھلایا۔ طالب علم اُس کے گرویدہ ہوتے جا رہے

تھے۔ اس کے لیکچر میں کلاس کھچا کھچ بھری رہتی۔

"یہ یہاں سچائی کی تلاش میں آئے ہیں جو کچھ میرے پاس ہے انہیں سب کچھ دینا میرا فرض ہے" ــــــ وہ بڑی امنگ سے لیکچر تیار کرتا لائبریرین کو نئی نئی کتابوں کی فہرست دیتا معمولی جھڑپوں، تنگ نظر کٹّر قسم کے استادوں کے طنز اور حوصلہ شکن رویّوں کی وہ قطعی پروا نہیں کرتا تھا مگر مشکلیں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں جس کتاب کو حوالے کے لئے استعمال کرنا چاہتا نایاب ہوتی۔ بار بار کے تقاضوں پر لائبریرین جواب دیتا ــــ "فنڈ نہیں ہے نئی کتابیں نہیں منگائی جا سکتیں۔ آپ چیف اکاؤنٹنٹ سے بات کریں۔"

چیف اکاؤنٹنٹ نے کہا وائس چانسلر ہی اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہیں۔

"چھوڑو کیوں خراب ہوتے ہو ان چکرّوں میں۔"

احمد کے ایک ساتھی نے خلوص سے مشورہ دیا۔ "تمہیں کیا مل جائے گا۔ یہ سالے بھی پڑھ کر کون سا تیر مار لیں گے۔ ہماری تمہاری طرح انہیں بھی جھک مارنی ہے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ میں جھک نہیں مار رہا۔ مجھے اپنے کام میں بہت دلچسپی ہے اور جنہیں تم اتنی غیر سنجیدگی سے لے رہے ہو میرے خیال میں

ان کے اندر بے شمار صلاحیتیں ہیں" ——— اُس نے اپنی فائل درست کرتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ غیر متعلق باتوں کے بارے میں اتنے پریشان کیوں ہوتے ہیں؟"
وائس چانسلر نے کرسی کی پشت پر سر ٹکاتے ہوئے پوچھا۔

احمد حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگا۔ اُسے بڑی امید تھی کہ وائس چانسلر بہت خوش ہوں گے۔ اُس کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ وہ خود تاریخ کے استاد رہ چکے ہیں۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ یہ مضمون کس قدر ہمہ گیر معلومات چاہتا ہے۔ لیمپ کی روشنی میں وائس چانسلر کی عینک کا سنہری فریم چمک رہا تھا۔ زرد روشنی، زرد قالین، زرد پردے اور زرد بیمار رنگت والے ان بزرگ کے سامنے بیٹھے بیٹھے وہ اپنے آپ کو یرقان زدہ محسوس کرنے لگا۔

"میں نے سنا ہے کہ آپ اپنے شاگردوں میں کمیونزم کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں" ——— وائس چانسلر نے اُسے گھورا۔

"میں تاریخ کا پروفیسر ہوں کوئی پبلسٹی فلم نہیں کہ میرے تعلیم دینے کے انداز کو آپ پروپیگنڈا کہیں" ——— وہ تلملا کر رہ گیا۔

"پچھلے دنوں انقلاب فرانس کی تاریخ پڑھاتے ہوئے کئی مرتبہ آپ نے مارکسسٹ نظریئے کا حوالہ دیا؟"

"یہ یونیورسٹی ہے یا جاسوسی کا محکمہ،" وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"کیا کسی دن آپ مجھے کلاس میں ہتھکڑیاں لگوائیں گے؟"

"آپ ناراض نہ ہوں۔ آخر یہ یونیورسٹی آپ کی بھی اتنی ہی ہے جتنی میری۔ اگر ہم یہاں طالب علموں کو اسلامی نظریے کے تحت تعلیم نہیں دیں گے تو انہیں پاکستان اور اُس کے نظریئے سے بھلا کیا دلچسپی ہو گی؟"

اب وائس چانسلر نے خوشامدانہ روّیہ اختیار کر لیا۔

"پاکستان سے دلچسپی اُسی وقت ہو گی جب آپ دنیا سے دلچسپی لینا انہیں سکھائیں گے۔ تاریخ پڑھنا ہی تو کافی نہیں۔ اُسے سمجھنے کے لئے ایک روّیے کا اجاگر کرنا بھی تو بہت ضروری ہے۔"

"اور یہ روّیہ اسلامی اور پاکستانی ہونا چاہیئے" —— وائس چانسلر نے رسان سے مگر تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"کیا میں نے اور آپ نے اسلامی اور پاکستانی نظریئے کے تحت تاریخ پڑھی ہے؟"

"وہ غلامی کا دور تھا۔ اب ہم آزادی سے اپنے مذہب اور وطن کی بنیادوں پر نئی نسل کے ذہن کو ڈھال سکتے ہیں۔"

وائس چانسلر نے سختی سے جواب دیا۔ انہیں احمد کی بے باکی گستاخی کی حد تک بڑھتی ہوئی لگی۔

"تو ایسا کیجئے" — دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو میز پر ٹکا کر وہ آگے جھک گیا — "ملک کے تمام تعلیمی ادارے بند کروا دیجئے۔ مسجدوں میں مدرسے کھول دیجئے تاکہ بچے قرآن اور تھوڑی بہت فقہ اور حدیث کے آگے کچھ نہ پڑھ سکیں۔"

"تعلیمی ادارے بند کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی انشاءاللہ ان کا ماحول خود ہی مسجدوں جیسا ہو جائے گا وہ زمانہ ضرور آئے گا" — وائس چانسلر نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔ وہ فی الحال کسی اختلاف کے بجائے یونیورسٹی میں اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنا چاہتے تھے۔

احمد نے ان کی میز کے پیچھے شیلف پر سجی انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا اور امریکانہ کی مجلّد قطاروں کو دیکھا۔ سیاہ فریم میں جڑی اُن کی آکسفورڈ یونیورسٹی کی ڈاکٹریٹ کی ڈگری پر ایک نظر ڈالی اور اُس بڑی سی تصویر کو جس میں وائس چانسلر جھکے ہوئے ملک کے حکمراں فیلڈ مارشل جنرل ایوب خان کو یونیورسٹی کی اعزازی ڈگری پیش کر رہے تھے دیکھتے ہوئے بڑی شائستگی سے پوچھا۔

"آپ نے کس مدرسے میں پڑھا ہے؟" — اور آفس سے باہر نکل گیا۔

"ایسی کی تیسی" ـــــ اُس نے فائل میز پہ پٹخ دی۔

"اُلّو کے پٹھے ـــــ" وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ جسم کا سارا خون اس کے سر اور چہرے میں جمع ہو گیا تھا۔

"تم نے بید کی لچکیلی ٹہنیاں دیکھی ہیں؟ جس سمت میں ہٹنا چاہو جھکا لو جھکتی جاتی ہیں مگر ٹوٹتی نہیں۔ اس ملک میں بھی بس جو ہٹتا اور جس سمت میں جھکتا جائے خوب پھلتا پھولتا ہے۔ اپنے اصولوں پر قائم رہنے والے بہت جلد پٹخ کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ یا پھر گوشہ نشین ہو جاتے ہیں۔ بہت اچھا کیا جو تم نہیں آئیں میں بہت پچھتا رہا ہوں اور ہر دم چھٹکارے کی سوچتا رہتا ہوں۔" اُس نے نجمہ کو لکھا۔ وہ ساری رات احمد نے ٹہلتے ہوئے گزار دی۔

مگر چھٹکارا اتنا آسان نہیں تھا۔ اُس کے ماں باپ بہنوں سمیت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان آ گئے تھے۔ لڑکیوں کی شادی کی عمریں نکل رہی تھیں۔ مالی اور گھریلو مسائل بڑھتے جا رہے تھے اور پھر سمجھوتوں کا زمانہ شروع ہو گیا۔ ملازمت میں سمجھوتے، دوستیوں اور تعلقات میں سمجھوتے ـــــ روحانی اور ذہنی محرومیوں کی دیوار اونچی ہوتی گئی اور اُس کے سائے میں سر کٹتے اُس کا پورا وجود جھکتا گیا۔ بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ نجمہ کے خط اب نہیں آتے تھے۔ وہ پاکستان آنا نہیں چاہتی تھی اور احمد کے لیے ہندوستان جانا ناممکن تھا۔ جس زمین پہ اس کی ان گنت پشتیں پیدا

ہوئیں اور مرکھپ گئیں جہاں وہ خود پیدا ہوا اور بچپن، اور جوانی کے بہترین دن گزارے اب اسی مٹی کو چھونے کے لئے وہ پل صراط بھی پار کر جاتا تو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اور گھر والوں نے اس کی شادی کر دی۔

بچے ہو گئے بظاہر سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ وہ اصولوں پر ڈٹے رہنے یا اُن کے لئے لڑنے سے کترانے لگا تھا۔ بیوی، بچوں کا مستقبل، ماں باپ کا بڑھاپا یا خود اُس کی اپنی زندگی یہ سب ذمّہ داریاں تھپکیاں بنی جا گئے میں بھی اُسے سلایا کرتیں اور اُس کے کھولتے ابلتے وجود پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے بنتی گئیں۔ ملک میں شاندار، صحت مند فوجیوں کی جو کلف لگی وردیوں میں ملبوس، سینوں پر تمغے سجائے اہم عہدوں پہ بیٹھے تھے اور خوش پوش، نفیس رہن سہن اور گھناؤنی عادتوں والے سرکاری افسروں کی حکومت تھی۔ پورا ملک بے گار کیمپ معلوم ہوتا تھا۔ ایک طبقہ دونوں ہاتھوں سے دولت بٹور رہا تھا۔ دولت کمانے کے نئے نئے بڑے آسان طریقے دریافت ہو رہے تھے۔ یہ کیفیت پورے ماحول میں کچھ یوں رچ بس گئی تھی کہ گھر گھر بس نئی نئی چیزوں کپڑوں، آسائشوں اور کھانے پینے کے تذکرے عام تھے۔ نئے خیالات، نئی امنگیں، حوصلے، سیاسی سوجھ بوجھ سب موت کے اندھے کنوئیں میں بند ہو گئی تھیں۔ بے زار ہو کر اُس نے نوجوانوں اور طالبعلموں

میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ سب کچھ اُسے فضول اور بے معنی لگتا۔ طالبعلموں کا ہر نیا گروہ، پچھلے گروہ سے زیادہ بے یقین، ناسمجھ اور مطلبی معلوم ہوتا۔ ماحول کی چھاپ ان پر بھی نمایاں تھی۔ ریڈیو، ٹی وی، اخبار، رسالے، کتابیں دن رات ان کی شخصیتوں میں زہر گھول رہے تھے۔ جھوٹ کا زہر، منافقت اور چالاکیوں کا زہر، گھٹیاپن اور کٹّرپن کا زہر —— ہر کوئی اُکھڑا اُکھڑا سا تھا۔ جیسے موقعہ ملتے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے گا۔

"تم بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟" ۱۹۴۷ء میں جمنا کے کنارے ابوالکلام آزاد بڑی بے بسی سے فریاد کر رہے تھے۔ "اپنے پرکھوں کی یہ زمین۔ اُن کی ہڈیاں چھوڑ کر یوں نہ بھاگو۔"

"بھاگو ——

"بھاگو —— بھاگو —— یہ بڈھا تمہارا دشمن ہے تمہاری موت کا خواہاں" —— ہجوم میں سے کوئی چیخا۔

"کب تک بھاگو گے؟ —— کس کس چیز سے بھاگو گے؟" —— دور اندیشن عالم سر پہ ہاتھ رکھے بڑی افسردگی سے پیش گوئی کر رہا تھا۔ "اس زمین پر تمہارا اتنا ہی حق ہے، جتنا دوسرے مذہب والوں کا۔ نہ جاؤ۔ تم ہمیشہ کے لئے اُکھڑ جاؤ گے۔ تمہاری اقدار، تمہاری روایتیں، تمہاری زبان، تمہارا اخلاق، سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔"

"لڑکے لڑکیوں کا اخلاق اس قدر گر گیا ہے کہ آپ لوگوں کو ان پر کڑی نگاہ رکھنی پڑے گی۔"

ایک میجر صاحب کو یونیورسٹی کا اخلاق سدھارنے کا ٹھیکہ دے

دیا گیا تھا۔

"اور کڑی نگاہ کس طرح رکھنی چاہیئے؟"

"آپ کسی لڑکے لڑکی کو کہیں اکھٹا دیکھیں تو انہیں منع کریں۔ کلاس میں دور دور بٹھائیں اگر کوئی لڑکا اور لڑکی منع کرنے کے باوجود دوبارہ ساتھ نظر آئیں تو اُن پر جرمانہ کر دیں۔ کم سے کم جرمانہ پچاس روپے ہوگا۔ اِس طرح یہ لوگ ان حرکتوں سے باز آجائیں گے۔"

"کن حرکتوں سے؟" احمد نے لطف لیتے ہوئے پوچھا۔

"لاحول ـــ بے غیرتی، اور کیا۔ کمال ہے آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ لڑکیاں جلد ڈر جاتی ہیں۔ ان میں شرم و حیا ہو گی تو لڑکے خود بخود اخلاقی حدود میں رہیں گے۔"

"اور لڑکیوں میں شرم و حیا کس طرح رہے گی؟"

"بدنامی کے خوف سے۔ یوں بھی آپ لوگ خیال رکھیں کہ اُن کے سروں پر دوپٹے ......"

"معاف کیجئے میں لڑکیوں کی آیا نہیں کہ اُن کے سروں پر دوپٹے ٹھیک کرواتا پھروں۔" احمد اندر ہی اندر بری طرح کھول رہا تھا۔

"اِن تالالت میں ـــ" میجر صاحب بوکھلا کر تتلانے لگے۔ انتہائی ضبط اور غصّے کے باوجود ہونٹوں کے کناروں پہ احمد اپنی مسکراہٹ نہیں

دبا سکا میجر نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا ـــــ "ان حالات میں مجھے وائس چانسلر سے رجوع کرنا ہو گا۔"

ایجنڈے کے بغیر اساتذہ کی میٹنگ بلائی گئی۔

"بائیں بازو کے عناصر کی روک تھام یہیں سے شروع کرنی چاہیئے"

صدرِ جلسہ کہہ رہے تھے۔

"ہاں یہ بہت ضروری ہے تاکہ معاشرے میں ایسے رجحانات پلنے بڑھنے نہ پائیں" ـــ کسی نے اُن کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"اس قسم کے خیالات رکھنے والے طالب علموں پر نظر رکھنی چاہیئے"

گول مول طریقے سے مطلب بیان کیا جا رہا تھا۔

"یہ تعلیمی ادارہ ہے یا تھانہ؟ اور ہم سب کیا ہیں؟ ٹہل لگانے والے بے مصرف اور نکھٹّو چوکیدار! انتہ کیبوں سے ڈکے ڈلوا رہے ہیں"

احمد نے بڑی بے زاری سے سوچا۔ اور تندہی سے ملک کے باہر جانے کی کوشش کرنے لگا۔

پس ماندہ ملکوں کے ذہین اور باصلاحیت لوگوں کو اپنے یہاں معمولی ملازمتیں دے کر بے مصرف اور بے کار بنانے کے لئے ترقی یافتہ

امیر ملکوں میں بہت سے ادارے ہیں۔ احمد نے ایسے ہی ایک ادارے میں ملازمت کی درخواست بھیج دی۔ کچھ دنوں بعد اُسے ادارے کی جانب سے خط ملا کہ اس کی درخواست قبول کر لی گئی ہے۔ اُس نے فوراً بیوی بچوں سمیت لندن جانے کی تیاری شروع کر دی۔

"یہ تم نے بہت غلط فیصلہ کیا ہے" ـــــ اس کے ایک دوست نے کہا۔

"بہت پہلے میں ایک بڑے فیصلے کی غلطی کا خمیازہ ابھی تک بھگت رہا ہوں اس کے بعد تو یہ سب کچھ بہت غیر اہم معلوم ہوتا ہے۔"

"کوئی بھی قدم جو ہم اٹھاتے ہیں، غیر اہم نہیں ہوتا۔"

"مجھے تو یہاں دُھول اڑتی دکھائی دیتی ہے"۔ احمد نے مایوسی سے کہا۔ "کیا ہے۔ یہاں؟ خواری اور مایوسی! یہ ملک مجھے کیا دے رہا ہے؟ کیا اِسے میری صلاحیتوں کی ضرورت ہے؟ یہاں تو صرف پیسے اور طاقت کے سامنے جھکنے والوں کی گنجائش ہے۔ سچ نہیں بول سکتا کہ غدّار کہلاؤں گا۔ اپنی محنت، ذہانت اور ایمانداری کے بل پہ باعزت اور بامقصد زندگی نہیں گزار سکتا۔ پھر آخر کیوں میں یہاں رہوں؟" احمد نے جھنجھلا کر بات ختم کرنے کے انداز میں کہا۔

اُس کا خیال تھا کہ باہر رہ کر شاید کچھ کام اپنی مرضی کا کر سکے گا مگر

ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ پروگراموں کی ترتیب، ترجمے، پیش کش اور ایڈیٹنگ ان کاموں میں وہ اپنی صلاحیتیں کبھی بھی اجاگر نہیں کر سکتا تھا۔ بظاہر آزاد فکر کی تبلیغ کرنے والے یہ ادارے اندر سے بڑے کٹر اور رجعت پسند ہیں۔ اور اپنے یہاں کام کرنے والوں کی آزادانہ روش ایک حد تک ہی برداشت کر سکتے ہیں خصوصاً غیر ملکیوں کی۔ اتنا عرصہ بیت جانے پر بھی وہ اپنے ہم وطن نوجوان اور متجسس لوگوں سے ملتا تو اُس کے اندر کا استاد تڑپ کر جاگ اٹھتا۔ انہیں کچھ دینے، ان کے علم میں اضافہ کرنے کی خواہش ابھر آتی۔

"آپ نے نہرو کی کتاب "ہندوستان کی تلاش" پڑھی ہے؟" — وہ ایک ایسے ہی مہمان سے اپنی بے حد کلچرڈ آواز میں پوچھ رہا تھا۔

"بڑی تلاش اور صبر کے بعد مجھے اپنی مرضی کی ملازمت ملی" — نجمہ سڑک کے کنارے لکڑی کی ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ چلتے چلتے وہ پکاڈلی سرکس سے بہت دور آ گئے تھے۔ سامنے بگ بین کے گھنٹے کی سوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی — "مایوسی اور طویل انتظار کے بعد"۔

"سب کچھ چھوڑ دوں، چلی جاؤں یہاں سے" — شدید روحانی جذباتی اور ذہنی اذیت کے دنوں میں وہ ٹہلتی ہوئی سوچا کرتی۔ مگر تذبذب اور غیر یقینی کا یہ دور مختصر ثابت ہوا۔ خصوصاً دو جنگوں کے بعد سے تو

اُسے اپنے فیصلے کی سچائی پر بے پناہ اعتماد ہو گیا تھا۔

"جو ہُوا سو ہُوا" ——— وہ سگریٹ پھینک کر ایک نئی توانائی سے کام میں جُت جاتی "بہت کام کرنا ہے" ——— وہ اپنے طالب علموں سے کہتی۔ اپنی اِس پروفیسر کی جوان ہمّتی دیکھ کر اِن کی بڑی ڈھارس بندھتی۔ اُسے اپنے شاگردوں میں بڑا یقین نظر آتا۔ یہ اعتماد طویل جمہوریت اور بے باک ماحول کا ورثہ تھا۔ وہ ملک کی سیاست اور دوسرے مسائل میں حصّہ لے رہے تھے۔ ہندو اور مسلمان لڑکے لڑکیاں بغیر کسی پچھتاوے اور شرمندگی کے آپس میں شادیاں کر رہے تھے۔ گھر بسا رہے تھے۔ گو کہ بڑی کھینچا تانی، بورڑوا سوسائٹی کی لعنتیں اور نا انصافیاں۔ مگر بے گانگی اور بے دلی کا احساس نہیں تھا۔

"آؤ گھر چلیں" ——— احمد نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑے۔ نجمہ، احمد کے گھر سے کچھ فاصلے پر اپنی بہن کے یہاں ٹھہری ہوئی تھی۔

"میں نے سنا ہے پاکستان میں لوگ کئی کئی گھر بناتے ہیں ڈھیروں زمینیں خریدتے ہیں۔ وہاں یہ بڑا کاروبار ہے۔ تم نے کیا کیا؟" ——— نجمہ نے پوچھا۔

"میں نے یہ سب کیا ہوتا تو یہاں نہ آتا"——احمد نے زندگی میں پہلی مرتبہ لندن کے نواح میں گھر خریدا تھا۔

"ملک کی معیشت تو ان ہتھکنڈوں سے جلد برباد ہو جائے گی"۔

"وہ تو ہو چکی کب کی"۔

بس آ چکی تھی۔

"فون پر تمہاری آواز سنی تو برسوں کا عرصہ لمحوں میں طے کر کے بہت دور ماضی میں پہنچ گیا۔ مگر تم نے مجھے تلاش کیسے کیا؟" بس میں سوار ہوتے ہوئے احمد نے پوچھا۔

دو بوڑھی انگریز عورتیں بڑے بڑے اوورکوٹ پہنے سامنے کی سیٹوں پر جا کر بیٹھ گئیں۔

"بہت آسان تھا۔ اکثر ریڈیو پر تمہاری اگر، مگر، چنانچہ اور تاہم، جھوٹ اور سچ، سنتی ہوں"۔

نجمہ کو انگریزوں کے محتاط اندازِ گفتگو سے ہمیشہ الجھن ہوتی تھی۔

"بہت دنوں سے بہن بلا رہی تھی۔ اب اسپین سے واپسی میں سوچا کہ ایک ہفتے یہاں ٹھہر جاؤں پتہ نہیں پھر کبھی موقعہ ملے یا نہ ملے۔ ایک مرتبہ تم سے ملنے کی خواہش بھی تھی"۔ وہ گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"تم بہت شاندار اور باہمت ہو۔ تمہارا خیال آتا ہے تو اپنا وجود

بڑا گھٹیا اور بے مصرف معلوم ہوتا ہے۔" احمد نے بہت خلوص سے کہا۔

وہ خاموش باہر دیکھتی رہی۔ خوشیاں کتنی جلد ہی اذیتیں بن جاتی ہیں اور خواب پورے ہو جائیں تو شاید ان کی آرزو بھی نہ رہے۔ برسوں پہلے کالج کی ہری بھری تنہائیوں میں بہت سے ان کہے وعدے، آنکھوں کی جنبش، نہ رکنے والی مسکراہٹیں، اُسے بری طرح یاد آنے لگیں۔ کبھی کبھی محبت انسان کو بہت بلند کر دیتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں اور ضرورتوں سے بے نیاز۔ وہ جس جذبے کی بھٹی سے سلگ کر نکلی تھی اُس نے، اُس کے لئے بہت سی خواہشوں اور آسائشوں کو بے معنی بنا دیا تھا۔ اتنے بڑے ذاتی غم اور محرومی کے بعد آدمی یا تو بہت مضبوط اور فراخ دل ہو جاتا ہے یا بہت بزدل اور بے بس۔ کچھ سوچ کر وہ کمزور لہجے میں بولی۔

"ہاں کم از کم ہمارے ملک میں کہنے سننے کی آزادی ہے اور یہ بڑی بات ہے ——— تم پچھلے سال ہندوستان آئے تھے۔ مجھ سے ملے کیوں نہیں؟" اس نے اچانک شکایت کی۔

اگلی سیٹ پر ایک نوجوان جوڑا بیٹھا تھا۔ لڑکی کسی بات پر ناراض تھی اور مسلسل رو رہی تھی۔ لڑکا اُس پر جھکا ہوا اُسے منانے اور بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی اُس کا سر چومتا، کبھی گلے لگاتا مگر لڑکی تُنک کر اُس کا ہاتھ جھٹک دیتی۔

"احساسِ جرم! اور یہ خیال کہ تم نے مجھے معاف نہیں کیا ہو گا۔ پھر تم تھیں بھی اتنی دور مدراس میں"۔

"میں نے تمہیں معاف نہیں کیا ہو گا؟" ——نجمہ کے ہونٹوں پر موہوم سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ملاتے ہوئے سوچ میں ڈوب گئی۔ "یوں کہو کہ تم نے اپنے آپ کو ابھی تک معاف نہیں کیا، مسلسل ایک سزا کی اذیت میں مبتلا ہو۔ گھوم پھر کر اُسی دہانے پر پہنچ جاتے ہو جس میں ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگیاں آرزوئیں، اُمنگیں، عزت اور شرافت ایک جھونکے کی ساتھ بھر گئے تھے۔ مگر وہ دہانہ ابھی تک نہ جانے کیا کچھ نگلنے ہضم کرنے اور تباہ کرنے کے لئے اُسی طرح منہ پھیلائے کھڑا ہے"۔

"یہ ہندوستان؟ یہ پاکستان؟" ——امرتسر، لکھنؤ، دہلی، لاہور اور کراچی ہر جگہ احمد کی سب سے چھوٹی بچی جو لندن میں پیدا ہوئی تھی دونوں ہاتھ پھیلا کر بڑی حیرت سے پوچھتی، پاکستان میں اُن کے رشتے دار تھے اور ہندوستان میں دوست۔ بچّی بار بار اپنے ذہن میں دہراتی یاد کرنے کی کوشش کرتی مگر پھر گڑبڑ کر دیتی اور ایک ایک سے پوچھتی۔

"یہ ہندوستان ہے؟ - یہ پاکستان ہے؟"

سرحد پار کرتے ہوئے واگہ پر کسٹم افسر نے احمد کے برطانوی پاسپورٹ

پر مہر لگاتے ہوئے پوچھا۔

"آپ ہندوستانی ہیں یا پاکستانی ہے؟"

"تم ہندوستانی ہو یا پاکستانی ہے؟" — نجمہ نے بہت پرانے لہجے میں بڑی بے ساختگی سے پوچھا۔

کتنوں کو پاگل بنا دیا تھا اس شاعرانہ خود اعتمادی نے! احمد کھو سا گیا۔ باہر کہرا بہت گہرا ہو گیا تھا۔ مدھم، ٹمٹماتی بتیوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بس کنڈکٹر ٹکٹ کی مشین لئے اُن کے قریب کھڑا تھا۔

"سفر میں ہمیشہ برطانوی پاسپورٹ پر کرتا ہوں" — اُس نے کچھ رک کر کہرے پر نظریں جمائے ہوئے جواب دیا۔

"اور یہ سفر کب ختم ہوگا ہے؟"

"ٹکٹ پلیز" — انگریز بس کنڈکٹر اُسے بے زاری اور غصّے سے دیکھ رہا تھا۔